ہندوستانی ادب کے معمار



ساحر لدھیانوی

سلیمان اطہر جاوید

ساحر لدھیانوی

ہندستانی ادب کے معمار

ساحر لدھیانوی

سلیمان اطہر جاوید



ساہتیہ اکادمی

Sahir Ludhianvi : A monograph in Urdu by Sulaiman Ather Jaweed on the Urdu poet. Sahitya Akademi, New Delhi (2007), Rs.25

پہلا ری پرنٹ : 2007

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس

رویندر بھون۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس

سواتی، مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر

جیون تارا بھون۔ چوتھی منزل، ۲۳ اے / ۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالے، دادر ممبئی ۴۰۰۰۱۴

گنا بلڈنگ، دوسری منزل۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵، انا سلائی، تیہام پیٹھ۔ مدراس ۶۰۰۰۱۸

اے۔ ڈی۔ اے رنگ مندر ۱۰۹ جے۔ سی۔ روڈ۔ بنگلور ۵۶۰۰۰۲

قیمت : 25 روپے

ISBN 81-260-0115-1

طابع : آر۔ کے۔ آفسیٹ پروسیس، دہلی

ترتیب

حالاتِ زندگی

لدھیانہ، ریاست پنجاب کا ایک اہم صنعتی اور تجارتی شہر ہے۔ یہ شہر، پنجاب کے ایک مشہور دریا ستلج سے ۱۱ کلو میٹر کے فاصلہ پر بڈھا نالہ کے کنارے واقع ہے، لدھیانہ اسی نام کے ضلع کا صدر مقام بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کبھی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جس کا نام 'میر ہوتا' تھا لیکن لودھی سلاطین نے اپنے اقتدار کے دوران یہاں ایک بڑا شہر آباد کیا۔ اسی نسبت سے اس کا نام لودھیانہ رکھا گیا جو بعد میں کثرتِ استعمال سے لدھیانہ ہو گیا۔

ساحر کے اجداد کا تعلق گوجر قوم سے تھا۔ ان کے دادا فتح محمد اپنے زمانے کے نامی گرامی رئیسوں اور زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے بیٹے اور ساحر کے والد چودھری فضل محمد بھی بہت بڑے زمیندار تھے۔ سیکھے وال اور اس کے نواح میں ان کی خاصی زمینداری تھی۔ وہ شہر کے معزز اور معتبر لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ چودھری فضل محمد میں وہ ساری اچھائیاں اور برائیاں تھیں جو زمیندار طبقے کے افراد میں پائی جاتی ہیں۔ انھیں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اور غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ انھوں نے دس شادیاں کیں لیکن پھر بھی اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ انھوں نے گیارھویں شادی سردار بیگم سے کی جو کشمیری النسل تھیں۔ سردار بیگم کے والد عبد العزیز ٹھیکیدار تھے جن کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکے محمد شفیع اور عبد الرشید اور لڑکیاں شاہ بیگم اور سردار بیگم — سردار بیگم جو سب سے چھوٹی تھیں ساحر کی والدہ تھیں۔

ساحر کی پیدائش ۸؍ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ میں ہوئی۔ چونکہ ساحر اپنے والد کی

پہلی اولادِ نرینہ تھے اس لیے ان کی پیدائش پر شاندار جشن رہا۔ والد نے قرآن شریف دیکھ کر اپنے بیٹے کا نام عبدالحی رکھا۔ ساحر کی کم سنی کا زمانہ نہایت ناز و نعم میں گزرا لیکن ہوا کچھ ایسے کہ ساحر کے والدین کی آپس میں بنی نہیں۔ اس سلسلے میں کئی باتیں مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ساحر کے والد فضل محمد، ساحر کی والدہ سردار بیگم کو خاندانی لحاظ سے اپنے ہم حیثیت متصور نہیں کرتے تھے اس لیے وہ اس رشتے کو راز میں رکھنا چاہتے تھے دوسری طرف ساحر کی والدہ کسی پردہ پوشی سے کام لینا نہیں چاہتی تھیں۔ خاص طور پر ساحر کی پیدائش کے بعد وہ اپنے سماجی موقف کو منوانے پر اور اصرار کرنے لگیں۔ فضل محمد، ساحر اور ان کی والدہ کو مالی اور مادی طور پر سب کچھ دینے پر آمادہ تھے لیکن سماجی طور پر مساوی موقف دینا انھیں منظور نہیں تھا۔ دونوں میں ناچاقی بڑھی اور اتنی کہ سردار بیگم نے اولاً علٰحدگی اختیار کی اور پھر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس وقت ساحر کی عمر ۶ ماہ تھی۔ اس سے قطع نظر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فضل محمد جس عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے اس کے لیے ان کی آمدنی ناکافی تھی۔ انھوں نے اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کے لیے بتدریج اپنی جائیداد فروخت کرنی شروع کی۔ ساحر کی والدہ کو یہ سب کچھ ناپسند تھا۔ اوّل تو انھوں نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن فضل محمد پر کیا اثر ہوتا خود سردار بیگم نے مایوس ہو کر شوہر سے علٰحدگی اختیار کرلی۔ ساحر اپنی ماں کے ساتھ تھے سردار بیگم یہ سمجھتی تھیں کہ شوہر راہِ راست پر آجائیں گے لیکن یوں کہیے ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ فضل محمد کو قانونی طور پر جائیداد کی آمدنی سے استفادہ کا حق تھا۔ لیکن اس کو فروخت کرنے کا اختیار نہیں۔ سردار بیگم شوہر کی ساری جائیداد کا تنہا وارث اپنے بیٹے ساحر کو سمجھتی تھیں چنانچہ انھوں نے عدالت میں اپنے شوہر کے خلاف دعویٰ دائر کردیا۔ یہ مقدمہ ۱۸، ۲۰ سال تک چلتا رہا اور سردار بیگم اپنے زیورات اور جو بھی اثاثہ تھا مقدمہ کی نذر کر بیٹھیں۔ ایسے میں ماں بیٹے کی سرپرستی ساحر کے ماموں عبدالرشید نے اپنے ذمہ لی جو میوہ فروش تھے۔ ایک موقع پر فضل محمد نے عدالت میں درخواست پیش کی کہ ان کے بیٹے کو سردار بیگم سے لے کر ان کے حوالہ کردیا جائے کیونکہ سردار بیگم ان سے علٰحدگی اختیار کرچکی ہیں۔ فضل محمد نے یہ موقف اس لیے بھی اختیار کیا کہ سردار بیگم سے علٰحدگی کے بعد ہرچند کہ انھوں نے ایک اور

(بارھویں) شادی کی تھی لیکن اس بیوی سے بھی انھیں اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنے کا انھیں قانونی طور پر حق حاصل تھا لیکن اوّل تو یہ کہ ساحر نے عدالت میں بیان دیا کہ وہ ماں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ فضل محمد نے عدالت میں جو بیان دیا اس سے ان کے موقف پر ضرب پڑی اور ان کا مقدمہ کمزور ہوگیا۔ فضل محمد نے اگرچہ اس کا تیقن دیا کہ سوتیلی ماں کا سلوک ساحر سے ٹھیک رہے گا اور عدالت اس تعلق سے مطمئن بھی ہوگئی۔ لیکن اس سوال پر کہ ساحر کی تعلیم کا کیا انتظام کیا جائے گا فضل محمد نے کہا کہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے لڑکا پڑھ لکھ کر کیا کرے گا۔ بیٹھ کر کھائے گا۔ اس بیان کے بعد جج کا فیصلہ ساحر کی ماں کے حق میں ہوا کہ بچہ ماں کے ساتھ رہے گا کیونکہ ماں تعلیم دلوا رہی ہے۔ باپ کے ساتھ رہے تو بچہ جاہل رہے گا۔ چنانچہ ساحر اب قانونی طور پر ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ ساحر اس وقت پانچویں جماعت میں مالوہ خالصہ ہائی اسکول، لدھیانہ کے طالب علم تھے جہاں انھوں نے فیاض ہریانوی سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں سے انھوں نے انٹر کا امتحان کامیاب کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخل ہوئے۔ ساحر نے کالج کے داخلہ کے لیے اپنی درخواست میں کھیلوں کے خانے میں کرکٹ لکھا تھا۔ ہابی کے طور پر فوٹو گرافی اور بڑا ہو کر وکیل بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

گورنمنٹ کالج لدھیانہ کا زمانہ وہ تھا کہ ساحر کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا انھیں ابتداءً کسی قدر تحریکِ احرار سے بھی لگاؤ رہا لیکن وقتی طور پر۔ ساحر نے اگرچہ بی۔ اے میں مضامین انگریزی، فارسی، فلسفہ، تاریخ اور اردو لیے تھے لیکن انھیں معاشیات اور سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے طور پر کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اسی زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر طلبہ کی تنظیم آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ساحر کا ربط پیدا ہوگیا۔ ساحر نے تنظیم کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ مزدوروں کے جلسوں میں تقاریر کیں اور سیاسی موضوعات پر نظمیں پڑھیں جن میں "انٹی وار فنڈ" منظومات اہمیت رکھتی ہیں۔ ساحر کی والدہ کو بیٹے کی ان سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن ان کے والد ناخوش تھے۔ ساحر کے والد انگریز دوست اور حکام رس آدمی تھے۔ عام جاگیرداروں کی طرح وہ انگریزوں کے قریب ہونا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ساحر کے والد کو افسوس تھا کہ بیٹا ان افراد کے ساتھ ہے جو باپ کی زمینداری کو

ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں ان کی خوشی کا پہلو یہ تھا کہ ان کا بیٹا مشہور شاعر بن گیا ہے۔

ساحر گورنمنٹ کالج لدھیانہ ہی میں تھے کہ میرٹھ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "کیرتی لہر" میں ان کے باغیانہ لب ولہجہ کی منظومات شائع ہونے لگیں۔ اس زمانے کی ساحر کی ایک معروف نظم ہے " قسم ان تنگ گلیوں کی جہاں مزدور رہتے ہیں"۔ "کیرتی لہر" سامراج دشمن اور کیمونسٹ نظریات کا حامل تھا۔ یہ ساحر کی شاعری کا عبوری دور تھا لیکن اس دور کی اور خاص طور پر "کیرتی لہر" میں شائع شدہ ان کی منظومات ان کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں۔ یہ ۱۹۴۴ء کے لگ بھگ کا زمانہ ہے اور اس زمانے کے ساحر کے دوستوں میں کامریڈ موہن لال دویدی، حافظ لدھیانوی، احمد ریاض، حمید اختر عجائب چترکار، آرٹسٹ ہری کشن اور عبدالحمید عدم تھے۔

ساحر پر حکومت کا عتاب ہونا لازمی تھا چنانچہ ان کی بعض نظمیں ضبط کرلی گئیں۔ اس پس منظر میں جب کہ ساحر بی۔اے کے آخری سال میں تھے پنجاب کے مشہور انقلابی شہید کرتار سنگھ سرابہ کا یوم شہادت منایا گیا۔ بیشتر انقلابی نوجوان کرتار سنگھ کے گاؤں سرابہ پہنچے، ساحر بھی ان میں شامل تھے جہاں انھوں نے نظم پڑھی۔ گورنمنٹ کالج کے ارباب بست وکشاد کو یہ بات ناگوار گزری چنانچہ ساحر کو مجبوراً کالج چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے نہ صرف کالج چھوڑا بلکہ لدھیانہ سے لاہور منتقل ہو گئے۔ جہاں انھوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ اس دور کے ان جذبات واحساسات کو ان کی نظم "نذر کالج" میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دیال سنگھ کالج میں داخلہ کے بعد یہاں انھیں طلبہ کی انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔

ساحر نے ہر چند کہ ایک جاگیردارانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور ان کی کم سنی کا زمانہ بھی اسی ماحول میں گزرا لیکن اپنے ذاتی اور خاندانی حالات کی وجہ سے انھیں جاگیردارانہ ماحول سے سخت نفرت تھی، بائیں بازو کے خیالات کے حامل اور وطن پرست ہونے کی وجہ سے برطانوی سامراج سے بھی انھوں نے نفرت کا اظہار کیا اور جلد ہی ان دونوں نظاموں کے خلاف ان کے باغیانہ رجحانات واضح ہو گئے اور اب تو انھوں نے علانیہ انقلابی شاعری شروع کردی اور بہت کم عرصہ میں سارے کالج اور شہر کے ہیرو بن گئے۔ ساحر کی ادبی شہرت کا آغاز ہو چکا تھا، تعلیم سے انھیں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے جب وہ بی۔اے میں تھے امتحان سے قبل ہی تعلیم ترک کردی، کالج چھوڑ دیا۔ نئے تعلیمی سال کے آغاز پر انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں

نہیں چل سکا۔ اور اب انھوں نے اپنا سارا وقت اور ساری صلاحیتیں ادب اور سیاست کے لیے وقف کردیں۔ اسی زمانے میں ساحر اپنے وقت کے اردو کے معروف اور نہایت معیاری جریدہ "ادبِ لطیف" کے ادارہ سے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے۔ اس طرح ساحر کے برِصغیر کے مشہور اور نامور ادیبوں اور شاعروں سے روابط پیدا ہوئے اور خود شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت روز بروز افزوں ہونے لگی۔ ۱۹۴۴ء میں ساحر کا شعری مجموعہ "تلخیاں" شائع ہوچکا تھا جس کی ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی تھی۔ یوں ساحر صفِ اول کے ممتاز شاعروں میں گنے جانے لگے۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد کے ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ ساحر نے اس کانفرنس میں شرکت کی اور اپنا مقالہ پڑھا۔ ساحر کا نام یوں تو بیشتر کی زبان پر تھا اور ان کی شاعری سے کئی واقف تھے لیکن شخصی طور پر ساحر کی ملاقاتیں بہت کم اصحاب سے تھیں۔ مقالہ پیش کرنے کے بعد ترقی پسند قلم کاروں کی گویا ایک دنیا ساحر سے ذاتی طور پر متعارف ہوگئی۔ سجاد ظہیر نے ساحر کو گلے لگایا اور جب بمبئی کا قافلہ واپس ہونے لگا تو سجاد ظہیر، کرشن چندر، سردار جعفری اور مجاز وغیرہ ساحر کو اپنے ہمراہ بمبئی لے گئے۔

تقسیمِ ہند اور ملک کی آزادی کے وقت ساحر بمبئی میں تھے اور ان کی والدہ لدھیانہ میں — یوں تو ملک کے بیشتر حصوں میں فسادات پھوٹ پڑے تھے لیکن لدھیانہ ان علاقوں میں تھا جہاں فسادات کی نوعیت ہر زاویہ سے شدید تھی۔ ساحر بمبئی سے نہایت پریشانی کے عالم میں دلی آئے لیکن یہاں کے شب و روز ہی اور تھے۔ انسان انسان کا دشمن بن چکا تھا، انسانیت تلملا رہی تھی، اقدار سر برہنہ تھیں۔ حالات ناقابلِ بیان حد تک بُرے تھے۔ ساحر اپنے ایک ہندو دوست کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب فسادات کی آگ اور بھڑکی اور صورتِ حال اور غیر یقینی ہوگئی تو ساحر کو مصلحتاً اور با دلِ ناخواستہ اپنے عزیز ہندو دوست کا گھر چھوڑ کر ایک سکھ دوست کے یہاں پناہ لینی پڑی۔ دہلی میں ساحر نے فسادات کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ انسانیت کو تڑپتے اور ایڑیاں رگڑتے پایا۔ ساحر نے ان دنوں کے اپنے جذبات اور محسوسات کو نظم "آج" میں پیش کیا ہے اور یہ نظم انھوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر کی۔ اس نظم سے ساحر کی انسان دوستی اور اخوت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔

فسادات کے باعث حالات اتنے سنگین تھے کہ ساحر کا لدھیانہ جانا خطرات کو دعوت دینا تھا بلکہ ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر بھی ساحر کے ہندو اور سکھ احباب نے ساحر کی والدہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ ساحر کے دوستوں میں مدن لال دویدی، پینٹر باوڑی، جوگیندر پال پانڈے اور کامریڈ اوم پرکاش وغیرہ نے جو ساحر کی ماں کو اپنی ماں کی طرح سمجھتے تھے پاکستان جانے والے کیمپ میں پہنچا دیا اور پینٹر باوڑی کی کوششوں سے ساحر کی ماں کو لاہور جانے والے قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ اور ان میں کامریڈ اوم پرکاش کو جن پر فسادیوں کا الزام تھا کہ مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں، قتل کر دیا گیا۔ بہر کیف کچھ ہو ساحر کے دوستوں کو خوشی ہوئی کہ ساحر کی امی بحفاظت پاکستان پہنچ گئی ہیں۔ جب حالات نے سنبھالا لیا، ساحر کسی طرح لاہور پہنچے کہ اپنی والدہ کو ڈھونڈیں۔ ساحر کی والدہ مجلس احرار کے لیڈر اور معروف ادیب اور صحافی شورش کاشمیری کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ساحر کو تھوڑی بہت تلاش کے بعد اپنی ماں کا پتہ چل گیا۔ (ساحر کے والد فضل محمد اپنے متعلقین کے ساتھ پہلے ہی لائل پور جا چکے تھے۔ جہاں ۱۹۶۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

لاہور تو ایک طرح ساحر کا وطن ثانی تھا۔ یہاں ان کے دوست احباب اور چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ چودھری نذیر بھی یہیں تھے جو ساحر کے پرانے مداح تھے۔ انھوں نے دو ماہی جریدہ "سویرا" جاری کیا جس کے ادارے میں احمد ندیم قاسمی اور ساحر شامل تھے۔ ممکن ہے ساحر لاہور میں رہ جاتے لیکن "سویرا" ترقی پسند ادب کا نمائندہ تھا بلکہ کمیونسٹ نظریات کا حامل، حکومتِ پاکستان کی نظروں میں یہ کھٹکتا رہا، ساحر کا بددل ہونا لازمی تھا۔ یوں بھی انھوں نے ہندوستان کو پاکستان پر ترجیح دی اور اپنی امی کے ساتھ دہلی آ گئے۔ جہاں ۱۹۴۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس کے مالک بدر صاحب اور محمد یوسف جامعی کے تعاون سے ماہنامہ "شاہراہ" جیسا ادبی تاریخ ساز جریدہ جاری کیا۔ ساحر "شاہراہ" کے ایڈیٹر اور پرکاش پنڈت جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے "شاہراہ" نے جو کردار ادا کیا ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ "شاہراہ" ہی کے ساتھ ساحر نے سردار گوربخش کے جریدہ "پریت لڑی" کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ پرکاش پنڈت اس جریدہ کے بھی نائب مدیر تھے اور ان دونوں کا قیام پل بنگش میں تھا۔ ان دنوں جوش ملیح آبادی بھی پل بنگش میں رہتے تھے۔ یوں تو شاہراہ

ایک زمانے تک شائع ہوتا رہا لیکن اس رسالے سے ساحر کا تعلق صرف دو شماروں تک رہا۔
مئی ۱۹۴۹ء میں بھیمڑی (بمبئی) میں ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی ساحر اس کانفرنس میں شرکت کے لیے بمبئی آئے اور اس کے بعد انھوں نے بمبئی میں مستقل طور پر قیام کا فیصلہ کیا۔ ساحر پہلے بھی بمبئی آچکے تھے اور ان کا قیام سلیمان چیمبر میں تھا پھر وہ وارڈن روڈ منتقل ہوئے۔ اب جب انھوں نے بمبئی میں مستقل سکونت کا فیصلہ کیا تو پہلے وہ چار بنگلہ (اندھیری) میں کرشن چندر کے گھر (کوور لاج) میں رہے اور فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے جب ان کی مالی حیثیت اچھی ہوگئی تو انھوں نے کرشن چندر کے مکان کی بالائی منزل خالی ہونے پر اس کو کرایہ پر لے لیا اور اپنی امی کو جوالا آباد میں اپنے بھائی کے ہاں تھیں بمبئی لے آئے اور یہیں رہنے لگے۔ فلموں میں نغمہ نگار کی حیثیت سے ساحر کے بارے میں آئندہ کسی باب میں تفصیل ملے گی، یہاں بس اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ سخت اور مسلسل جد و جہد کے بعد ساحر ایک آسودہ اور خوش حال زندگی گزارنے لگے تھے۔
ساحر بڑی پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ کیفی اعظمی نے ساحر کا سراپا ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "ساڑھے پانچ فیٹ کا قد، جو کسی طرح سیدھا کیا جائے تو چھ فیٹ ہو جائے لانبی لانبی لچکیلی ٹانگیں، پتلی سی کمر، چوڑا سینہ، چہرے پر چیچک کے داغ، سرکش ناک، خوبصورت آنکھیں، آنکھوں میں جھینپا جھینپا سا تفکر، بڑے بڑے بال، لجلجی چال، جسم پر قمیص، پتلون منڈھی ہوئی اور ہاتھ میں سگریٹ کا ٹن۔" [۱]

رات بارہ، ایک بجے تک جاگنا ساحر کا معمول تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا اور دوستوں کے تو وہ رسیا تھے۔ اپنے خاندانی پس منظر کے باعث مہمان نوازی ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی۔ دعوتیں کرنا اور وقت بے وقت احباب کی مدد کرنا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ رام پرکاش اشک، ساحر کے دیرینہ اور قریبی دوست تھے۔

---

[۱] صابر دت (مرتبہ) فن اور شخصیت "ساحر لدھیانوی نمبر"، ساحر پبلشنگ ہاؤس، بمبئی ۵۸ فروری ۱۹۸۵، ص ۲۹۳

جب وہ کینسر کا شکار ہوئے تو ساحر نے ان کے علاج کے لیے ممکنہ تعاون کیا حتیٰ کہ انھیں اپنے خرچ پر امریکہ روانہ کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اشک صحت یاب نہیں ہو سکے اور اسی موذی مرض نے ان کی جان لے لی۔ و نیز کرشن ادیب، پریم وار برٹنی اور ماسٹر نثار جیسے کئی دوستوں کی انھوں نے مالی اعانت کی۔ اس شاہ خرچی کی وجہ بھی ہو گی کہ ساحر اپنے احباب میں "شاہزادہ" کے نام سے مشہور تھے۔

ساحر لدھیانوی بائیں بازو کے خیالات اور اشتراکی رجحانات کے حامل تھے لیکن وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں رہے۔ یہی نہیں انھوں نے کسی جماعت کی باضابطہ رکنیت بھی کبھی اختیار نہیں کی۔ ہاں مارکسزم سے انھیں دلچسپی تھی جس کے اپنے اسباب تھے۔ مارکسزم کا انھوں نے مطالعہ تو کیا ہی تھا و نیز اوّل تو یہ کہ بچپن میں انھیں اپنے باپ اور عزیزوں کی محبت نہیں مل سکی جو انسانی شخصیت کی تعمیر میں اہمیت رکھتی ہے دوسرے یہ کہ ایک زمانے تک انھوں نے معاشی اور مالی تکالیف برداشت کیں۔ بمبئی میں اپنے قیام کے ابتدائی دور میں انھیں بعض اوقات نہایت ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہونا پڑا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ بجلی اور پانی کا بل ادا کرنے کے لیے انھیں اپنی ماں کی سونے کی چوڑیاں بھی فروخت کرنی پڑیں اور کبھی ماہانہ (۱۵۰) روپے پر کرشن چندر کی کہانیوں کے مسودات کو خوش خط لکھنے کا کام بھی انجام دینا پڑا۔ بعد میں ساحر کے پاس دو کاریں آچکی ہوں اور ملک میں کہیں جانا ہو وہ اپنی کار میں سفر کرتے ہوں لیکن ایک زمانے میں وہ بمبئی میں لوکل ٹرین میں آیا جایا کرتے تھے — ان سب چیزوں نے محنت کش طبقہ سے ان کے دل میں ہمدردی پیدا کر دی اور یہ ہمدردی جذباتی اور نظریاتی نہیں عملی تھی۔ انھوں نے سرمایہ داری کے خلاف جذبات کا اظہار شاعری ہی میں نہیں کیا۔ عملاً سیاسی جد و جہد میں بھی حصہ لیا۔ بمبئی کی مزدور بستیوں میں ان کا آنا جانا رہا۔ اس طرح فیض کے الفاظ میں بھی ساحر نے عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی۔

ساحر نہایت ملنسار، منکسر المزاج، خوش طبع اور دوست نواز انسان تھے۔ ہاں کبھی کبھی جھنجھلا اٹھتے اور دوست احباب پر برس جاتے لیکن جلد ہی اپنے پر قابو پا لیتے۔ سماج کے نچلے، مظلوم، مقہور اور کچلے ہوئے طبقات سے انھیں ہمدردی تھی۔ انسانی اقدار سے پیار تھا۔ یہ ساری چیزیں ان کی زندگی اور ان کی شخصیت کا بھی حصہ تھیں اور

ان کی شاعری کا بھی۔ چنانچہ ان کی شاعری کے مطالعہ سے جو تصویر قاری کے ذہن پر مرتب ہوتی ہے وہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں لوگ مذہب، دولت، نسل اور رنگ کی بنیاد پر نہ ایک دوسرے سے اختلاف کریں اور نہ ان بنیادوں پر ایک دوسرے کا استحصال۔ ایسا معاشرہ جو جہالت، بھوک اور افلاس سے پاک ہو، ایسا معاشرہ جہاں عورت کی عزت اور عصمت محفوظ رہے۔ ایسا معاشرہ جو چین، شانتی اور امن کا معاشرہ ہو — اور کوئی شبہ نہیں ساحر نے ایسے معاشرہ کے لیے اپنی زندگی اور اپنے فن کو وقف کر دیا تھا۔

ساحر کو اپنی زندگی میں بے انتہا مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ انھیں عزت بھی ملی اور اعزازات بھی۔

اہلِ لدھیانہ کو بلا تخصیص مذہب و ملت ساحر سے غیر معمولی محبت تھی۔ اس محبت کی بے پناہی کا اندازہ شاید اہلِ لدھیانہ کو بھی نہیں تھا اور شاید ساحر کو بھی نہیں۔ اپنی محبت و عقیدت کا اظہار اہلِ لدھیانہ نے کئی مواقع پر کیا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء کو گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی تقاریب منائی گئیں اور طے کیا گیا کہ کالج کے ایسے قدیم طالب علموں کو اعزاز دیے جائیں جنھوں نے زندگی کے کسی شعبہ میں امتیازی خدمات انجام دی ہوں۔ اس خصوص میں کالج کے اربابِ اقتدار کی نظر ساحر لدھیانوی اور مشہور مصور ہری کشن لال پر پڑی۔ ان دونوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا اور ان کی نمایاں خدمات کا فراخدلانہ اعتراف کرتے ہوئے انھیں طلائی تمغے دیے گئے۔ و نیز ۱۹۷۵ء میں سول لائنز لدھیانہ کی ایک مصروف سڑک کو ساحر لدھیانوی مارگ سے موسوم کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں حکومتِ ہند نے ساحر کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹرا اردو اکادمی نے ساحر کو ایوارڈ سے نوازا اور اسی سال ساحر کو مہاراشٹرا اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اسی کے ساتھ حکومتِ مہاراشٹر کی طرف سے وہ جسٹس آف پیس (JUSTICE OF PEACE) قرار پائے اور ۱۹۷۴ء میں انھیں اسپیشل اگزیکیٹو مجسٹریٹ (SPECIAL EXECUTIVE MAGISTRATE) کا درجہ دیا گیا۔ حکومتِ پنجاب نے بھی انھیں ریاست کے اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ سے سرفراز کیا جب کہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۷ء کو جالندھر میں منعقدہ ایک عظیم الشان جلسہ میں حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم سردار سکھ جندر سنگھ نے ساحر

کو طلائی تمغہ "ابھینندن گرنتھ" اور سروپا (شال) کے علاوہ نقد رقم پیش کی۔

بین الاقوامی سطح پر بھی ساحر کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں شعری مجموعہ "آؤ کوئی خواب بنیں" پر ساحر کو "سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ" پیش کیا گیا۔

ساحر کے لیے یہ بھی بڑے اعزاز کی بات ہے کہ ۱۹۷۲ء کی ہند۔ پاک لڑائی میں ہمارے نوجوانوں نے بعض فوجی چوکیوں کو ساحر سے موسوم کیا اور ۱۹۷۵ء میں آرمی سروس کور کی طرف سے انھیں یہ اعزاز ملا کہ فوجی ترانہ

لکھنے کی خواہش کی گئی۔ ساحر نے فوجی نوجوانوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہ ترانہ لکھا جو ۴ اگست ۱۹۷۵ء کو ریکارڈ کیا گیا۔ یہ ترانہ ہمارے فوجی نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوا۔

ساحر نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ البتہ ساحر کے معاشقوں کے بارے میں نہ جانے کتنے قصے، کتنی روایات مشہور ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام پنجابی زبان کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم کا ہے جنھوں نے اپنی خود نوشت سوانح "رسیدی ٹکٹ" میں ساحر سے اپنی محبت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ یہ سوانح ساحر کی حیات ہی میں شائع ہو کر خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ لتا منگیشکر اور سدا ملہوترا جیسی گلوکارائیں بھی ساحر سے منسوب رہ چکی ہیں۔ ساحر نے لتا کی سحر انگیز اور نہایت دل کش آواز سے متاثر ہو کر ایک نظم بھی لکھی تھی جو سب سے پہلے دہلی کے ایک رسالہ "فنکار" میں شائع ہوئی۔ یہ نظم لتا منگیشکر کے نام ہی معنون کی گئی تھی۔ اس وقت "فنکار" کے ایڈیٹر بھر کاش پنڈت تھے۔ یہ نظم "تلخیاں" کے بعد کے ایڈیشنوں میں "تیسری آواز" کے بعنوان شریکِ اشاعت کی گئی مگر انتساب حذف کر دیا گیا۔ لتا کی محبت کی یادگار ساحر کی ایک اور نظم "انتظار" بھی ہے۔ یہ نظم بھی نہ صرف "تلخیاں" میں شامل ہے بلکہ ایک فلم میں فلمائی بھی گئی ہے اور بھی بعض نام ساحر کے ساتھ لیے جاتے رہے۔ ساحر کی امی کو بھی بیٹے کی شادی کی بڑی آرزو تھی اور شادی نہ ہونے کا انھیں زندگی بھر افسوس رہا۔

ساحر کو اپنی امی سے بے پناہ محبت تھی جس کا ایک اظہار تقسیمِ ہند کے وقت ہوا کہ امی کے پاکستان چلے جانے پر ساحر نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر پاکستان کی راہ اختیار کی اور انھیں ہندوستان لے آئے۔ ساحر جہاں رہے امی کے ساتھ رہے۔ بعد میں ساحر

کی ماموں زاد بہن انور، ان کے ساتھ رہنے لگیں جن کو ساحر اپنی سگی بہن سے زیادہ عزیز رکھتے تھے کہ جن کے والد نے ساحر کی اور ان کی امی کی ایک زمانے تک پرورش کی تھی۔ ساحر کی امی کا ۳۱ر جولائی ۱۹۷۶ء کو انتقال ہوا۔ ساحر کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا جس کو انھوں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ وہ بجھ سے گئے۔ امیؔ کی وفات کے بعد ساحر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان کی بہن انور پر آگئی لیکن ماں کی محبت کا خلا بہن کی محبت پورا نہیں کر سکی۔ ساحر دن بہ دن تنہائی پسند ہونے لگے جیسے اب انھیں اس دنیا سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی ہو۔ وہ اپنے تنہا تنہا وجود کو زیادہ سنبھال نہیں سکے اور آخر شنبہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو (۵۹) سال (۷) ماہ اور (۱۷) دن کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور بمبئی ہی میں مدفون ہوئے —— ایک ستارہ جو کبھی لدھیانہ میں طلوع ہوا تھا بمبئی میں غروب ہوگیا۔

ساحر کی شاعری

ساحر کی ادبی زندگی کی ابتدا ان کے اسکول کے زمانے ہی سے ہو چکی تھی۔ ساحر مالوہ خالصہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے کہ شعر گوئی کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پہلی نظم ایک دوست کے ذریعہ اسکول کے استاد فیاض ہریانوی کی رائے جاننے کے لیے بھیجی۔ ظاہر ہے یہ ابتدائی نوعیت کی نظم ہوگی۔ فیاض ہریانوی نے نظم دیکھ کر کہا۔ "اشعار موزوں ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے نظم معمولی ہے۔" ساحر کے لیے یہی بڑی بات تھی کہ اس وقت کے ایک استاد نے ان کی پہلی تخلیق کو موزوں قرار دیا۔ ان دنوں شاعری میں استادی شاگردی کا طریقہ تھا لیکن ساحر نے اپنی اس پہلی تخلیق کے بعد کسی کو اپنا کلام نہیں بتایا اور خود اپنے طور پر شعر کہنے لگے۔ جہاں تک ساحر کے تخلص اختیار کرنے کا تعلق ہے۔ یہ واقعہ بھی عجیب ہے۔ وہ کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے کہ کوئی اچھا سا تخلص مل جائے، اسی دوران اُن کی نظر اقبال کے اس مرثیہ پر پڑی جو انھوں نے داغ کی یاد میں لکھا ہے۔ اس شعر پر گویا وہ رک سے گئے ؎

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

انھیں لفظ "ساحر" پسند آیا اور اس قدر کہ اس کو اپنے تخلص کے بطور اختیار کر لیا اور ساحر لدھیانوی بن گئے۔

ساحر نے ابتدا میں چند ایک کہانیاں اور تھوڑے بہت تنقیدی مضامین بھی لکھے لیکن یہ اصناف ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو سکیں اور انھوں نے شاعری کی طرف جو ابتدا

میں توجہ دی تھی۔ وہی ان کا مشغلہ ٹھہرا، وہی فن اور وہی زندگی۔

ساحر نے جس زمانے میں شاعری کا آغاز کیا، اقبال کی وفات ہو چکی تھی اور جوش اور احسان دانش کی شہرت کا زمانہ تھا۔ جوش، شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے دنیائے شاعری پر چھائے ہوئے تھے اور احسان دانش شاعرِ مزدور کہلاتے تھے۔ ان دونوں کی بڑی دھوم تھی۔ فیض، سردار جعفری اور مجاز، ساحر کے ہم عصروں میں تھے۔ اقبال سے وہ بے حد متاثر تھے۔ یہاں تک کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود انھوں نے اقبال کو اس صدی کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا۔ اقبال سے قطع نظر جوش، مجاز اور فیض کی شخصیت اور شاعری کے اثرات ان کی شخصیت اور شاعری پر پائے جاتے ہیں۔ گوپال متل کی شخصیت کا بھی ساحر پر اثر رہا۔ گوپال متل ہی نے ساحر کو سب سے پہلے سوشلزم کے تعلق سے کتابیں پڑھنے کو دیں۔ نئے شاعروں میں ساحر، نریش کمار شاد کو پسند کرتے تھے۔

ساحر کے نزدیک اچھے شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ خوبصورت ہو، سچا ہو اور مفید ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شاعری میں جمالیاتی حسن، حقیقت نگاری اور افادیت پر زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ساحر کا زاویۂ نظر روایتی شاعری سے مختلف تھا۔ وہ کمیونزم سے متاثر تھے اور ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن بھی — اس وجہ سے انھوں نے اپنے فن کو اس تحریک کی اعلیٰ اقدار کا ترجمان بنایا چونکہ وہ اقتصادی آزادی کے حامی تھے اس لیے انھوں نے اپنے محسوسات اور جذبات کو مارکسی نظریات سے ہم آہنگ کر کے شاعری کے پیرہن میں پیش کیا۔

ساحر کا تعلق معاشرہ کے معاشی حیثیت سے اونچے طبقہ سے رہا، جاگیردارانہ اور زمیندارانہ معاشرہ — اس معاشرہ کے منفی اور گھناؤنے پہلوؤں پر ان کی نگاہ تھی۔ حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ انھیں اپنے خاندان سے قطع تعلق کرنا پڑا لیکن انھوں نے اس معاشرہ سے یونہی بغاوت نہیں کی بلکہ انھوں نے جب دیکھا کہ محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور غریبوں سے انتہائی ناگوار سلوک کیا جاتا ہے اور عورت کی حیثیت کسی کھلونے سے بڑھ کر نہیں تو ان کے اندر کے انسان نے ان چیزوں کو گوارا نہیں کیا۔ کہیں جھنجھلاہٹ اور تلخی، کہیں ہلکے طنز اور کہیں رواں دواں تبصرے کے ساتھ انھوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کی۔ ساحر کی شاعری کو ان کے معاشرے کے خوب و خراب، پیچ و خم اور

سیاہ و سفید کا ردِعمل کہنا چاہیے۔ ساحر کے مجموعہ کلام "تلخیاں" کے ہر ایڈیشن کے ابتدائی صفحہ پر یہ شعر درج ملتا ہے ؎

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

یہ محض ایک شعر نہیں، ساحر کا اپنی شاعری کے بارے میں وضاحت نامہ ہے۔ اور بقول شخصے اس کو ساحر کے مجموعہ کلام کا دیباچہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ایک بات خاطر نشان رکھنی چاہیے کہ اس نوعیت کی جو شاعری ہوتی ہے وہ بالعموم جذباتی شاعری ہوتی ہے اور اس میں زیادہ تر نعرہ بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ ساحر کے ہاں بھی جذباتیت ہے اور کہیں کہیں اِدھر اُدھر نعرہ بازی بھی مل جائے گی لیکن وہ بہک نہیں جاتے۔ ان کی شاعری اپنے کئی ہم عصروں کے مقابلہ میں شستگی اور شائستگی کی حامل، سنبھلی ہوئی اور معتدل لب و لہجہ رکھتی ہے۔ ساحر کے سیاسی نظریات خواہ کچھ ہوں انھوں نے اپنے کلام کو صرف اپنے عقائد کی تبلیغ اور سیاسی پروپگنڈہ کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ جذبات کی ترسیل میں تہذیبی آداب اور ادبی اقدار سے کام لیا۔ ان کے دردمند دل نے جو کچھ محسوس کیا انھوں نے اسی اخلاص کے ساتھ اس کا اظہار کر دیا۔ ان کی شاعری بس یہی ہے!

ساحر کے کلام کے تا حال چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "تلخیاں" کا پہلا ایڈیشن ادارہ "پریت لڑی" نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا جب کہ ساحر ابھی طالب علم تھے۔ "تلخیاں" کے تا حال (۲۵) سے زائد ایڈیشن اردو میں اور ایک درجن سے زاید ایڈیشن ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ گورمکھی رسم خط میں بھی "تلخیاں" کا ایڈیشن چھپ چکا ہے۔ وہ ایڈیشن ان کے علاوہ ہیں جو برصغیر کے کئی ناشروں نے غیر قانونی اور ناجائز طور پر چوری چھپے شائع کیے ہیں۔ ساحر کا دوسرا مجموعہ کلام "پرچھائیاں" ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ یہ دراصل امنِ عالم کے موضوع پر تحریر کردہ ایک طویل نظم ہے اور اس تحریک کا حصہ جو جنگ باز طاقتوں کے انسانیت کش عزائم کو روکنے کے لیے دنیا بھر کے امن پسند ادیبوں، شاعروں اور دیگر دانشوروں نے شروع کی تھی۔ "پرچھائیاں" کو بعد میں "تلخیاں"

کے ۱۴ویں اور ۱۵ویں ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ساحر کا تیسرا مجموعۂ کلام "آؤ کوئی خواب بُنیں" ہے جو ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اس میں بھی "پرچھائیاں" شامل ہے۔ "آؤ کوئی خواب بنیں" میں ساحر کا ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء تک کا کلام ملے گا۔ اس مجموعہ کے بھی ایک سے زاید ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ "گاتا جائے بنجارہ" ساحر کے فلمی گیتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بھی تا حال تقریباً دو درجن ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی اس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے و نیز بے شمار غیر ملکی زبانوں مثلاً انگریزی، روسی، چیک، فرانسیسی، فارسی اور عربی میں بھی ساحر کے کلام کے ترجمے ہو کر ان زبانوں کے پڑھنے والوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ساحر کی بین الاقوامی مقبولیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۵ء میں ایک ممتاز امریکی اسکالر کارلو کوپالا (KARLO KOPALA) نے اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے بعنوان (۷ ½) سو صفحات پر مشتمل ضخیم اور وقیع مقالہ لکھا جس پر شکاگو یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ اس تحقیقی مقالہ کے لیے برِ صغیر کے جن پانچ شاعروں کا انتخاب کیا گیا تھا ان میں ساحر بھی شامل تھے۔

ساحر کو اپنی زندگی میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ بہت کم ادیبوں اور شاعروں کو حاصل ہوئی ہوگی۔ ساحر اپنی مصروفیات کی وجہ سے مشاعروں وغیرہ میں کچھ ایسا زیادہ شریک نہیں ہوا کرتے تھے لیکن وہ جب بھی جہاں جاتے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ وہ سامعین کی توجہ اپنی شخصیت اور شاعری کی طرف مرکوز کر لیتے۔ اس کے ایک نہیں کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ان کی شاعری کے موضوعات عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے کلام میں عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی نہایت خلوص اور خوش سلیقگی سے کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اپنی بات کو صاف، سیدھی اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔ انھوں نے ہمیشہ سلیس اور مانوس الفاظ سے کام لیا اور جہاں تک ان کے لہجہ کا تعلق ہے انھوں نے دھیمے، مدھم، خنک اور دل میں اتر جانے والے لہجہ کو ترجیح دی اس لیے ان کو اپنی شاعری کے پسند کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا — آیئے! ہم ساحر کی شاعری کا تفصیل سے جائزہ لیں:

نظم نگاری

ساحر لدھیانوی نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی۔ نظم اور غزل دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ کمیت کے لحاظ سے ان کی نظموں کا پلّہ بھاری ہو لیکن جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے ان کی نظمیں بھی متاثر کرتی ہیں اور ان کی غزلیں بھی۔ ویسے وہ ایک نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں اور بقول کسے نظم میں ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ ایک کامیاب غزل گو تھے۔ ساحر کے چار شعری مجموعوں میں "گاتا جائے بنجارہ" فلمی گیتوں اور نغموں پر مشتمل ہے اور "پرچھائیاں" طویل نظم ہے۔ دیگر دو مجموعوں "تلخیاں" اور "آؤ کوئی خواب بنیں" میں نظمیں بھی شامل ہیں اور غزلیں بھی — ساحر نے ہر چند کہ اپنی شعرگوئی کا آغاز، اپنی اسکول کی زندگی سے کر دیا تھا لیکن ان کی نظموں کی اشاعت اس وقت سے عمل میں آنے لگی جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے طالب علم تھے۔ اوّل اوّل ان کی نظمیں ہفت روزہ "کیرتی لہر" میرٹھ میں شائع ہونے لگیں۔ ان کی ایسی ابتدائی نظموں میں "...... جہاں مزدور رہتے ہیں" بھی شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ساحر کے اس دور کی نظمیں ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں یہ نظمیں ابتدائی نوعیت کی ہوں گی جن کو ساحر نے اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت نظر انداز کر دیا ہوگا۔

ساحر کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ رومان، حقیقت اور رومان — انھوں نے اپنے عنفوانِ شباب میں رومانی شاعری کی، اس کے بعد مارکسزم کے اثرات کی وجہ سے حقیقت نگاری کو اپنایا اور آخر میں ان کے کلام میں پھر رومانیت جلوہ گر ملتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں کہیں رومانیت غالب رہی ہو

اور کہیں انھوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہو لیکن ان کے ہاں قطعی رومانیت اور قطعی حقیقت پسندی کم ہی ملتی ہے اور ان کے ہاں رومانیت اور حقیقت پسندی کے تانے بانے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور یہ امتزاج اس قدر خوبصورت اور متوازن انداز میں ہے کہ ساحر کے کلام کی دلآویزی افزوں ہوگئی ہے۔ اسی طرح ساحر کے موضوعات، ان کی زبان اور لہجہ و اسلوب میں بھی ایک اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ساحر نے عوام سے اپنے ربط کو ہمیشہ مضبوط اور برقرار رکھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو عام انسانوں کے دکھ درد کی تفسیر بنانے کی سعی کی۔ ان کے ہاں محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں، مظلوموں اور مقہوروں کے جذبات احساسات کی تصویریں اور تفسیریں ملتی ہیں۔ عام انسانوں کی بدحالی کے انھوں نے مرقعے کھینچ دیے ہیں۔ عورت کی مجبوری، بے بسی اور بے کسی پر انھوں نے جس انداز سے قلم اٹھایا ہے اردو کے بہت کم شاعروں کے ہاں یہ چیز ملتی ہے۔ ساحر کی شاعری کو ہم نوعی طور پر انسان دوستی کی شاعری قرار دے سکتے ہیں۔ نیز جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے ساحر صاف، سادہ اور دو ٹوک زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ دور از کار تشبیہات اور استعارات وغیرہ سے انھوں نے اجتناب کیا ہے۔ ان کا لہجہ دھیما ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے خواہ کسی موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہو ان کے پیرایۂ بیاں میں کوئی تبدیلی نہیں ملتی۔

ساحر کے ابتدائی دور کی منظومات میں "تاج محل" کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نظم سب سے پہلے معروف جریدہ "آج کل" دہلی میں شائع ہوئی۔ تعجب اس بات پر ہے کہ کہا جاتا ہے ساحر نے کبھی تاج محل نہیں دیکھا بلکہ وہ آگرہ بھی نہیں گئے لیکن اس نظم کی اشاعت نے اردو کی ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچادیا۔ تاج محل پر تاریخی اور تعمیراتی زاویوں سے جو بھی لکھا گیا اپنی جگہ، لیکن تہذیبی طور پر تاج محل ایک قابل لحاظ موضوع ہے اور ہمارے شعر و ادب کا ایک اہم عنوان! تاج محل پر سکندر علی وجد اور مکیش حیدرآبادی وغیرہ کی منظومات ملتی ہیں جن کا زاویہ کچھ اور ہے لیکن ساحر نے جس نقطۂ نظر کو کام میں لیا ہے اس کی انفرادیت کو آج تک بھی کوئی چیلنج نہیں کرسکا۔ ساحر نے تاج محل کو مارکسی اور اشتراکی پہلو سے دیکھا۔ ان کے نزدیک تاج محل دراصل شہنشاہیت اور مظلومیت کی علامت ہے، شناخت ہے۔ نظریاتی طور پر اگر یہ بات ہے تو ادبی زاویہ سے یہ کہا جاسکتا

ہے کہ ساحر نے یہاں موضوع اور مواد پر زور دیا ہے، ہیئت پر ساحر کی توجہ نہیں رہی۔ گویا اگر فنکار کی موضوع پر گرفت ہے، تخیل بلند احساس پختہ اور بات اس کے ذہن میں صاف ہے تو خواہ کوئی پیرایہ اور کوئی ہیئت اختیار کی جائے، بات موثر انداز میں کہی جا سکتی ہے۔ تاج محل کو بلاشبہ ساحر ہی کی نہیں اردو کی بھی ہمیشہ ہمیشہ مقبول ترین منظومات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ساحر نے محنت کشوں سے اپنی ہمدردی اور خیر خواہی کا نہایت اپنائیت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ یہ بند دیکھیے :

میری محبوب انھیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

اور اس نظم کا آخری بند تو ہر زاویہ سے یادگار ہے ؎

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب، کہیں اور ملا کر مجھ سے

مغل شہنشاہیت سے تعلق رکھنے والی ساحر کی ایک اور نظم "نور جہاں کے مزار پر" ہے۔ یہاں بھی نور جہاں مظلومیت کی علامت ہے اور یہ دونوں نظمیں بادشاہوں اور بادشاہت سے ساحر کی شدید نفرت کا مظہر بن جاتی ہیں۔ "نور جہاں کے مزار پر" کا پہلا ہی بند ہے ؎

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

ساحر، ظاہر ہے شہنشاہیت ہی کے نہیں جاگیرداری نظام کے بھی خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی نظم "جاگیر" میں اس نظام کا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔ اس نظام نے مزدوروں اور کسانوں کا جو استحصال کیا ہے، رعیت کا جو خون چوسا ہے ان سب کے بارے میں نہایت طنزیہ اسلوب میں باتیں کہی گئی ہیں۔

ساحر کی رومانی شاعری محض ان کے تخیل کی پرواز نہیں اور نہ روایتی انداز کی ہے۔ اگر ساحر کی زندگی اور بالخصوص ان کے عشق کے جو واقعات مشہور ہیں ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس رومانی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ساحر نے یہاں بھی حقائق کو شاعری کا روپ دے دیا ہے۔ "ہراس"، "میں نہیں تو کیا"، "خودکشی سے پہلے"، "کبھی کبھی"، "متاعِ غیر"، "اسی دوراہے پر" اور "خوبصورت موڑ" وغیرہ ساحر کی اچھی رومانی نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ ساحر نے اپنی رومانی نظموں میں کوئی فلسفیانہ اور تصوراتی باتیں نہیں کیں۔ ان کی رومانی نظموں میں غزل کی لفظیات بھی ہے اور غزل کے موضوعات بھی۔ ہجر، انتظار اور ناکامیٔ محبت ان کی نظموں کے عنوانات ہیں۔ کہیں تجدیدِ الفت کا اظہار ہے اور محبت پر پچھتاوا بھی (نظم: اسی دوراہے پر) کہیں محبوب سے جدائی ہے کہ وہ کسی اور کا ہو چکا ہے (میں نہیں تو کیا) کہیں دردِ ناکامی کی تصویر کشی کی گئی ہے (خودکشی سے پہلے) "متاعِ غیر" ایک پیاری رومانی نظم ہے جس میں محبوبہ کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن شاعر کے تصورات کی دنیا کی شہزادی بنی ہوئی ہے۔ شاعر کو اس کا احساس ہے لیکن پھر بھی اس کے لبوں پر یہی سوال، یہی بات ہے

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں

– – – – – – – – – – – –

– – – – – – – – – – – –

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن —
میری راتیں تیری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

"خوبصورت موڑ" اردو کی رومانی نظموں میں ایک نئے انداز کی نظم ہے۔ نہایت دل کش اور پُر اثر! دو چاہنے والوں کا ملاپ ممکن نہیں۔ کچھ سماجی حالات اور کچھ دونوں کا ذاتی پس منظر بھی ایسا کہ انھیں کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے۔ لہٰذا انقطاعِ محبت ہی اب مسئلہ کا حل ہے۔ اب یہی مناسب ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بھول جائیں، فراموش کر دیں، یہ آخری بند ملاحظہ ہو ؎

تعارف روگ بن جائے تو اس کا بھولنا اچھا
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کا توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو، اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں، ہم دونوں

"خودکشی سے پہلے" کی نوعیت کچھ اور ہے۔ یہ رومانی نظم ہوتے ہوئے بھی جس میں غمِ جاناں کا بھرپور اظہار ملتا ہے، غمِ دوراں سے بھی یہ نظم معمور ہے۔ البتہ اس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک دوسرے میں مدغم نہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان قدرے فاصلہ سا ملتا ہے۔ آٹھ بندوں کی اس نظم میں ابتدائی تین بند اور آخری بند غمِ جاناں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں بند سے غمِ دوراں کی تصویر سامنے آتی ہے۔ غمِ جاناں کے تعلق سے پہلا ہی بند ؎

اف یہ بے درد سیاہی یہ ہوا کے نوحے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

اور غمِ دوراں کے سلسلے میں چھٹا بند ؎

ظلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے

عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

ساحر کی رومانی شاعری ان کے دل کی آواز ہے تو ساحر کی سیاسی اور مسائلی شاعری ان کے دور کی آواز ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہو کہ بعد، ساحر نے بے شمار قومی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوں لیکن انسان دوستی اور امن پسندی، استحصال سے نفرت اور ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کا دامن انھوں نے کہیں نہیں چھوڑا۔ ایسی شاعری اپنی گونج گرج کے باعث بالعموم نعرہ بازی کی شکار ہو جاتی ہے۔ ساحر کے پاس بھی کہیں کہیں یہ کیفیت مل جاتی ہے لیکن ان کی شاعری بسا اوقات 'غیر ضروری جذبات سے مبرّا ہے۔ چونکہ عوام اور عوامی مسائل سے انھیں یک گونہ تعلق ہے لہٰذا اخلاص اور دردمندی کی وجہ سے ان کی ایسی منظومات پڑھنے والوں کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ ان کی ایسی سیاسی مسائلی نظموں میں "فنکار" ہے جس میں معاشرتی بہبودی کی تلاش ہے۔ "طرحِ نو" ہے جس میں محنت کشوں اور سرمایہ داروں کی کشمکش آشکار ہے۔ محنت کش سرمایہ داری کا تختہ الٹنے اور ایسا نظام قائم کرنے کے حق میں ہیں جس میں وہ خوش حال اور سرخ رو رہ سکیں۔ "یہ کس کا لہو ہے" ۱۹۴۲ء میں جہازیوں کی بغاوت کے موضوع پر ہے۔ جہازیوں نے یہ بغاوت وطن کی آزادی کی خاطر کی جس میں کئی فوجی ہلاک ہوئے "میرے گیت تمہارے ہیں" میں شاعر اپنے آپ کو مزدوروں اور کسانوں کے دوش بدوش لا کھڑا کرتا ہے۔ اسی طرح "کل اور آج" میں محنت کشوں کی زبوں حالی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ساحر کے ہاں اس نوعیت کی اور بھی نظمیں مل جائیں گی۔ مثلاً "لمحۂ غنیمت" جو مختصر سی نظم ہے لیکن جس میں بغاوت پر آمادگی کی مکمل دعوت دی گئی ہے۔ کفایت لفظی، بھرپور معنویت اور کسی جھول اور ٹھہراؤ کے بغیر یہ نظم قاری کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔ دیکھیے کیسی نظم ہے:

مسکرا، اے زمینِ تیرہ و تار
سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق

دیکھ، وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق

" اشتراکیت " ساحر کی مقبول اور وقیع منظومات میں ہے۔ اس میں مظلوموں اور مزدوروں کے جذبات کی ترجمانی تو ہے ہی اور یہ بھی کہ شاعر ان سب طبقات کو جابر طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے اور اپنا حق مانگنے کی ترغیب دیتا ہے لیکن اس نظم کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے اشتراکیت کی بھرپور تائید کی ہے۔ اس نظم میں ایک نئے انقلاب کے قدموں کی چاپ واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ جوشِ وجذبہ کی فراوانی، روانی اور نغمگی اور زبان و بیان کے اعتبارات سے بھی یہ نظم اپنی مثال آپ ہے۔ " مادام " میں ساحر نے معروضی انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے کسی پر الزام عاید کرنے کی بجائے ہندوستان کے افلاس و غربت، ناداری اور جہالت کی ذمہ داری خود اہلِ ملک پر عاید کی ہے کہ وہ تعلیم اور تہذیب میں آج بھی دیگر ممالک سے پیچھے ہیں۔ " آوازِ آدم "، " بشرطِ استواری "، " لہو نذر دے رہی ہے حیات "، " نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو "، " شہزادے " اور " شاعرِ فردا " ان کی ایسی ہی منظومات ہیں۔

اور یہ مسئلہ ہے تو کچھ اور لیکن جس کو سیاسی رنگ دے دیا گیا۔ یعنی ۱۹۴۴ء کا قحطِ بنگال — یہ قحط قدرت کی طرف سے نہیں، انسان کا پیدا کردہ تھا۔ برطانوی سامراج کی درندگی اور بہیمیت کی کھلی مثال۔ ہر انسان دوست اس قحط سے متاثر ہوا۔

ہمارے کئی شاعروں اور ادیبوں نے اس کو اپنے فن کا عنوان بنایا۔ متاثرہ عوام کے بارے میں اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے ان سے ہمدردی کو واضح کیا۔ ساحر کی نظم "قحطِ بنگال" بھی ایک پُرتاثیر اور بے مثال نظم ہے۔ زبان، بیان اور اسلوب کا شاہکار بھی۔ یہ اشعار دیکھیے ؂

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

ہندوستان اور پاکستان کے مابین جنگ نے برصغیر کی معاشرتی اور معاشی زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ سیاست دانوں کا کردار خواہ کچھ رہا ہو، قلم کاروں نے ہمیشہ امن دوستی، پیار اور محبت کا پیغام دیا کہ ہر دو ممالک کے عوام کی صلاح وفلاح اسی میں ہے۔ ساحر لدھیانوی نے بھی معاہدۂ تاشقند کی سالگرہ کے موقع پر، ہند، پاکستان جنگ کے پس منظر میں ایک عمدہ نظم تحریر کی۔ "اے شریف انسانو!" دل کی گہرائیوں سے نکلے یہ اشعار کیسا درد بھرا لہجہ رکھتے ہیں ؂

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی
اس لیے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے

آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

ساحر، ہماری قومی شخصیات میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت اور کردار سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے پنڈت نہرو کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جو نظم لکھی ہے وہ صرف ایک نظم اور ایک خراجِ عقیدت ہی نہیں بلکہ جواہر لال جی کے کردار کا اچھا خاصا مرقع اور ان کی شخصیت کی بازیافت ہے۔ ان اشعار میں پنڈت نہرو کی شخصیت اپنے سارے رنگوں کے ساتھ متاثر کن انداز میں سامنے آتی ہے، ملاحظہ ہو؂

وہ جو ہر دین سے منکر تھا ہر اک دھرم سے دور
پھر بھی ہر دین، ہر اک دھرم کا غم خوار رہا
ساری قوموں کے گناہوں کا کڑا بوجھ لیے
عمر بھر صورتِ عیسیٰ جو سرِ دار رہا
جس نے انسانوں کی تقسیم کے صدمے جھیلے
پھر بھی انساں کی اخوت کا پرستار رہا
جس کی نظروں میں تھا اک عالمی تہذیب کا خواب
جس کا ہر سانس نئے عہد کا معمار رہا
جس نے زردار معیشت کو گوارا نہ کیا
جس کو آئینِ مساوات پہ اصرار رہا

ساحر نے عالمی شخصیات اور بین الاقوامی مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس طرح ان کی عالمی امن سے وابستگی اور بین الاقوامی اخوت، دوستی اور بھائی چارگی کی اپنی تمناؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ کانگو (افریقہ) کے عوامی مقبول قاید لومبا کے قتل پر ان کی نظم "خون پھر خون ہے" معرکہ آرا ہے۔ "احساس کامراں" انھوں نے دوسری جنگِ عظیم میں نازی فوجوں کی شکست اور سوویت فوجوں کے جرمن سرحد عبور کرنے پر لکھی۔ یہ جوش و جذبے سے سرشار نظم ہے۔ احتجاج کی بھرپور اور موثر آواز، اس

نظم میں ملے گی۔ ایک بند درج کیا جاتا ہے ؎

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسہ نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں
جذبۂ نصرتِ جمہور کی بڑھتی رو میں
ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

اسپتنک کی ایجاد پر ساحر نے "میرے عہد کے حسینو!" جیسی تغزل سے بھرپور نظم لکھی اور سائنس کی اس ایجاد کو رومانی انداز میں سلام کیا۔ اس نظم کا آخری بند خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے ؎

مرے ساتھ رہنے والو' مرے بعد آنے والو
مرے دور کا یہ تحفہ تمھیں سازگار آئے
کبھی تم خلائے گزرو، کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گلعذار آئے

"چکلے" ساحر کی اہم ترین منظومات میں شمار ہوتی ہے۔ "چکلے" میں کیفی اعظمی کے بقول "ساحر کی غیرت، اس کی روح، اس کے احساس کی تلملاہٹ بلندی کے انتہائی نقطہ پر نظر آتی ہے۔ یہ نظم جوکئی ایک معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ فنّی اور ادبی خوبیوں سے بھی مزین ہے۔ اس میں ہماری تہذیبی قدروں کو جس فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے، تہذیب کے پاسبانوں، قیادت کا دعویٰ کرنے والوں، مذہب کے رکھوالوں، سماج کے ٹھیکیداروں، نام نہاد مصلحین، سفید پوشوں اور نعرہ بازوں پر جس عمدگی، شائستگی اور ادبی مہارت کے ساتھ طنز کیا گیا ہے اور کاری طنز کہ خود ساحر کی اور نظموں میں ایسی بلاخیزی نہیں ملتی۔ اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کرنے میں ساحر نے نہایت چابکدستی سے کام لیا ہے۔ اس نظم میں الفاظ کا انتخاب، مصرعوں کا دروبست اور مجموعی طور پر روانی اور غنائیت ساحر کو اپنے ہم عصروں میں امتیازی حیثیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ "چکلے"

کے یہ دو تین بند تو ضرور پڑھیں ؎

یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ پھولوں کے گجرے، یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہاں پیر بھی آچکے ہیں جواں بھی
تن ومند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

اور آخری بند میں تو طنز کی ضرب بھاری بھی ہے اور کاری بھی ؎

ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

ساحر کی منظومات کی اہم خوبی ان کی منظر نگاری ہے۔ ان کی بیشتر منظومات میں منظر نگاری سے دل کشی اور جگمگاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ منظر کھینچ ہی نہیں دیتے بلکہ انھیں یہ کمال حاصل ہے کہ منظر کو متحرک اور زندگی سے بھرپور محسوس کراتے ہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو یہی ہے کہ ساحر نے فطرت کا قریب سے اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ گویا وہ کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلے اپنی آنکھوں میں، اپنے تصورات

ہیں اور اپنے ذہن میں اس کو بسا لیتے ہیں اور جب وہ منظر ان کی شخصیت کا حصّہ اور ان کے قلم کا ضمیر بن جاتا ہے تو اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ منظر نگاری میں الفاظ کا انتخاب اور طرزِ ادا کا بھی خاطر خواہ حصّہ ہوتا ہے۔ ساحر کے ہاں یہ دونوں باتیں نکھرے ہوئے انداز میں ملتی ہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیتے اور نفاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا طرزِ ادا منظر کے لوازمات کا حق ادا کر دیتا ہے۔ ساحر کے پاس ایسی کئی نظمیں مل جائیں گی۔ "ایک واقعہ" کسی کو اداس دیکھ کر" "صبحِ نوروز"، "چکلے" اور "ایک منظر" وغیرہ — "ایک منظر" میں تو صرف منظر نگاری ہے۔ اگرچہ یہ مختصر سی نظم ہے لیکن بھرپور منظر نگاری کے باعث دل کش ہے۔ پوری نظم درج کی جاتی ہے ؎

افق کے دریچوں سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی، راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُر اسرار لے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصور میں لاکھوں دیئے جھلملائے

ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" میں تو منظر نگاری میں فلمی مونتاژ کا انداز ملتا ہے: کردار زندہ اور چلتے پھرتے سامنے ہوتے ہیں۔ منظر نگاری جادو جگا دیتی ہے۔ یہ دو بند ؎

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے

خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے

تم آ رہی ہو سرِ عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

"پرچھائیاں" تو منظر نگاری کے اعتبار سے ایک منفرد نظم ہے۔ کئی مواقع پر کئی نوعیتوں کی منظر نگاری کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن ——

"پرچھائیاں" صرف اس زاویہ ہی سے نہیں اور کئی زاویوں سے بھی بے مثال اور امتیازی حیثیت کی حامل نظم ہے۔ ہمارے ادب میں کئی پہلوؤں سے اس نظم کا تذکرہ کیا گیا اور کیا جاتا رہے گا۔

سب سے پہلے تو یہ کہ "پرچھائیاں" اردو کی ان چند نظموں میں شمار ہوتی ہے جن کو بے پناہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس نظم کا موضوع ہمارے عہد کا بنیادی اور اہم ترین سوال ہے، امن —— عالمی امن! —— پہلی اور پھر دوسری عالمی جنگ نے دنیا بھر کے عوام سے خوشگوار ماضی کی یادیں چھین لیں، حال کو غیر یقینی بنا دیا، اور مستقبل کو لایعنی اور ایک سوالیہ نشان! جنگ نے انسان کو کیا دیا؟ خواب ٹوٹ، بکھر گئے، یادوں کے کارواں لٹ گئے، آرزوئیں، تمنائیں، سسکتے تڑپتے، اپنے وجود کو سمیٹے نہ جانے کہاں کھو گئیں۔ ہولناک تباہیاں، بھیانک بربادیاں اور چار سو ویرانیاں۔ باہمی نفرت، لوٹ کھسوٹ، استحصال، معاشی بحران، تہذیبی بدحالی اخلاقی زوال، اقدار کی پامالی اور کیا کیا کچھ —— اس پس منظر میں امن دوستوں نے دنیا بھر میں آنے والے عہد کو جنگ کے مہیب خطرات سے دور اور محفوظ رکھنے کی کوشش کی، ملک ملک کے فنکاروں نے اپنی آواز بلند کی۔ علاقائی، مذہبی اور رنگ و نسل کے تفرقے مٹا کر سب ایک ہو گئے، جسدِ واحد کی طرح! ہر خطّے کے عوام نے امنِ عالم کے محضر

پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ "پرچھائیاں" بھی امنِ عالم کی اس ہمہ گیر تحریک میں اردو والوں کی جانب سے ساحر کا حصّہ ہے۔ خود ساحر نے اس نظم کی ابتدا میں لکھا ہے:

"'پرچھائیاں' میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں امن و تہذیب کے تحفظ کے لیے جو تحریک چل رہی ہے یہ نظم اسی کا ایک حصّہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوبصورت دنیا دے کر جائے۔ میری یہ نظم اسی کوشش کا ادبی روپ ہے۔"

یہ نظم کہانی کی تکنیک لیے ہوئے ہے۔ دو معصوم دلوں کی درد بھری داستان ہے، جنھیں جنگ کے ہاتھوں اپنے خوشگوار حال کو، اپنی معصوم اور پاکیزہ محبت کو بھینٹ چڑھانا پڑا۔ دو دل جس پیار بھری دنیا میں مست حال تھے، اپنے سے بے خبر تھے اور ایک رنگین، دلنواز اور حسین تر مستقبل کے خواب بُن رہے تھے وہ سب کچھ اجڑ گئے، بے نام ونشان ہو گئے۔ آرزوؤں کے آئینے شکستہ ہو گئے، ایک ویرانی سی ویرانی اور تا حدِّ نظر ویرانی کے سوائے کچھ نہ رہا — یہ نظم ان سب کے خلاف ایک احتجاج ہے، ایک آواز ہے۔ امن دوست انسانوں کا ردِعمل ہے۔ ساحر نے اس ردِعمل اس احتجاج اور اس آواز کو موثر شدید، گمبھیر اور باوقار بنانے کے لیے کچھ فنّی آداب کو بھی ایک ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے بحروں کی تبدیلی بار بار کی ہے۔ اردو نظم نگاری میں ہر چند کہ اس کو تجربہ کہنا چاہیے مگر یہ نہ صرف خوشگوار بلکہ کامیاب تجربہ بھی ثابت ہوا۔ نیز اس میں کہانی کا ڈھنگ ہی ہمارے عام اور روایتی انداز سے جداگانہ ہے۔ مناظر مختلف ہیں اور یکے بعد دیگرے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ قاری ان میں ایک اپنا پن اور کشش محسوس کرتا ہے۔ ساحر کو فلمی دنیا سے قریب ہونے، اس کا مطالعہ کرنے، اس میں جینے اور اس کے آداب و اطوار کو برتنے اور پرکھنے کا جو موقع ملا اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ساحر نے یہ تکنک براہِ راست فلم سے لی ہے۔ یہاں دو بند درج کیے جاتے ہیں جن سے اس تکنک

کا اندازہ ہوگا اور بحروں کی تبدیلی کی وجہ سے جو دلکشی پیدا ہوئی ہے اس کی نظر فریبی اور دلنوازی بھی محسوس کی جا سکے گی۔ بند ہیں ؎

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
وہ لمحے کتنے دل کش تھے وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں
بستی کی ہر اک شاداب گلی خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا، نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

نیز شاعر نے کہانی کو کچھ ایسے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے کہ محاکاتی کیفیت جا بجا واضح ہوتی ہے اور کہیں کہیں تو محاکات کے نہایت عمدہ نمونے سامنے آتے ہیں۔ ساحر نے کہیں مصوری بھی کی ہے اور کہیں رنگ کاری سے بھی کام لیا ہے۔

ساحر کی یہ نظم فکر انگیز بھی ہے۔ شاعر، مختلف مواقع پر اپنے پڑھنے والوں کو ٹھہر ٹھہر کر مطالعہ کرنے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مختلف مسائل، جو کسی علاقہ، مذہب، نسل اور زبان سے نہیں صرف انسان سے تعلق رکھتے ہیں۔

"پرچھائیاں" زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اونچا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ اس کی سادہ، سہل اور عام فہم زبان بھی ہے۔ ساحر نے اپنی بعض نظموں میں فارسی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ان کے ہاں چند ایک نظموں میں ہندی آمیز زبان بھی ملتی ہے۔ لیکن "پرچھائیاں" کی خوبی یہ ہے کہ روزمرہ، سہل اور سریلے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی باعث اس نظم کی زبان میں ایک نوع کی "عوامیت" ملتی ہے۔ بیانیہ انداز نے زبان کی اس خوبی کو کہیں زیادہ نکھار دیا ہے اور غنائی کیفیت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔ یہ دو تین اشعار ؎

انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے
بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے، اس راہ پہ راہی جانے لگے
دھول اڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دُکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں

اپنی ان ساری خصوصیات کے سبب ادبی اور عوامی، ہر دو حلقوں میں اس نظم کو بے پناہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں عالمی امن اور انسانیت سے اخلاص نے اس نظم کی تاثیر کو دہ چند کر دیا ہے۔ آخری بند تو معرکہ آرا ہے ؎

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

اس نظم پر کئی صاحبِ ذوق، کئی اہلِ قلم اور بے شمار ناقدین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ غیر معمولی طور پر یہ نظم سراہی گئی ہے لیکن سجاد ظہیر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ :

"ساحر نے اس نظم میں فن کی عظیم اور مقدس بلندیوں کو چھو لیا ہے۔"

غرض نظم نگار کی حیثیت سے اردو شاعری میں ساحر کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔

غزلیں

ساحر لدھیانوی نے جتنی خوبصورت اور وقیع نظمیں لکھی ہیں، اتنی ہی خوبصورت اور عمدہ غزلیں بھی — ہاں کمیت کے اعتبار سے غزلوں پر ان کی نظموں کا پلّہ بھاری ہے مجموعہ کلام "تلخیاں" میں غزلوں کی تعداد (۹) ہے لیکن مزید چار غزلیں بھی کہہ لیجیے۔ ہر چند کہ ان پر "اشعار" کا عنوان دیا گیا ہے لیکن ہیں یہ غزلیں ہی۔ ان کے مجموعہ "آؤ کوئی خواب بُنیں" میں "غزل" کے عنوان سے کوئی تخلیق نہیں لیکن "اشعار" کے عنوان کے تحت دی گئیں (۱۳) تخلیقات ایسی ہیں، جنھیں غزلوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یوں ساحر کی غزلوں کی جملہ تعداد (۲۶) ہوتی ہے اور بس — "فن اور شخصیت" کے ساحر لدھیانوی نمبر میں بھی، جس کو ساحر کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ایک دستاویز کی حیثیت حاصل ہے، شامل غزلوں کی تعداد (۲۶) ہے۔ ظاہر ہے یہ تعداد ایسی زیادہ نہیں لیکن معنویت اور کیفیت کے اعتبار سے ساحر کی غزلیں پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرلیتی ہیں اور ان میں سے کئی ایک کو اردو غزل کے کسی بھی انتخاب میں جگہ مل سکتی ہے۔

غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے! یہ آبرو ہے؟ اور کس حد تک؟ یہ سوالات اپنی جگہ، لیکن غزل، اردو شاعری کی روایت ہے، ایک ایسی روایت جو مستحکم بھی ہے اور رنگین و معتبر بھی! ساحر نے غزلیں لکھیں اور اردو شاعری کی روایت کا پاس بھی کیا۔ تاہم ان کی غزل روایتی نہیں، ایک نہیں کئی اعتبارات سے — ساحر نے حسن و عشق کے موضوعات اور اس خصوص میں اپنے جذبات اور احساسات و

تجربات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن ان کے ہاں حسن وعشق کے روایتی موضوعات ہیں اور نہ روایتی اندازِ بیان۔ غزل کی روایتی زبان ترشے ترشائے الفاظ، بندھی ٹکی تشبیہات، سجے سجائے استعارے اور ایسی ہی تلمیحات وغیرہ سے انھوں نے اپنی غزل کو بہت دور رکھا ہے، جب کہ اظہار کے پیرایہ میں ندرت و تازگی کے باعث ان کی غزل میں شوکت اور شادابی پائی جاتی ہے۔

ساحر کی عشقیہ شاعری کا ایک اہم موضوع ترکِ الفت ہے۔ غزلوں میں بھی اس موضوع پر اُن کے خاصے اشعار مل جائیں گے لیکن ساحر کے ہاں ترکِ الفت میں رونا پلانا، شکوہ شکایت کرنا اور واسوخت کا انداز نہیں ایک وقار اور بانکپن ہے، مصائب کو سہنے کا حوصلہ ہے، محبت کی توقیر کا احساس ہے، محبوب کے موقف کی پاسداری ہے وہ اس کی مجبوریوں اور تہذیبی عذرداریوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اشعار دیکھیے ؎

ہم سے اگر ہے ترکِ تعلق تو کیا ہوا
یارو! کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو

انھیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

ان کا غم، ان کا تصور، ان کے شکوے اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل، ہو گئیں آئی گئی

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

لیکن اس ترکِ محبت میں بھی نہ محبوب کی بے وفائی کو دخل ہے نہ عاشق پر اس کا الزام عاید ہو سکتا ہے بلکہ یہ تو حالات کی ستم ظریفی ہے، معاشرہ کی چیرہ دستی ہے اور غمِ روزگار ہے کہ ترکِ تعلق پر مجبور ہونا پڑا ؎

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا تھا غمِ روزگار نے

یہاں بھی موضوع وہی ترکِ محبت ہے، مگر اپنے انداز سے ؂

تو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید

تو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ساحر نے عشق و محبت کے عام موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے لیکن گھسے پٹے انداز میں نہیں بلکہ نکھرے ہوئے اور دلآویز پیرایہ میں۔ ان کے اسلوب کی طرحداری، اشعار میں تازہ کاری پیدا کر دیتی ہے۔ ان اشعار سے محسوس کیا جاسکتا ہے ؂

نگاہیں جھکتے جھکتے بھی بہم ٹکرا ہی جاتی ہیں

محبت چھپتے چھپتے بھی نمایاں ہو ہی جاتی ہے

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی

از سرِ نو داستانِ شوق دہرائی گئی

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو

برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے

ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

ان عشقیہ اشعار سے قطع نظر ساحر کی غزلیں زیادہ تر سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ غزل میں سیاسی اور معاشرتی وغیرہ مسائل پر اور شاعروں نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے، ٹھیٹ غزل گو اور روایتی شاعروں نے بھی لیکن ترقی پسند شاعروں کا نقطۂ نظر کچھ اور رہا ہے۔ انھوں نے ایک معاشرتی فلسفہ اور نظریۂ حیات کو کام میں لیا ہے۔ ساحر نے بھی زندگی کو اپنی نظر اور اپنے نظریہ سے دیکھا ہے۔ ان کے ہاں اشتراکی موقف کی کارفرمائی بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ساحر کے ہاں اور ترقی پسند شاعروں کی طرح غزل کا استعاراتی اور اشاراتی نظام بدلا ہوا ہے۔ غزلوں کے یہ اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ؂

فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے

امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلم جانا
اہلِ دل کے لیے وہ بات عجیب آج بھی ہے
ہے، جنھیں سب سے زیادہ دعویٔ حبِ وطن
آج ان کی وجہ سے حبِ وطن رسوا بھی ہے
منصفِ شہر کی وحدت پہ نہ حرف آجائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں

اس سلسلے میں ساحر کی غزل، جس کی ردیف "..... پہ کیا گزری" لاجواب ہے۔ اس میں تقسیمِ ہند اور اس کے بعد کے ہنگاموں اور فسادات وغیرہ کا نہایت ایمائی اور اشاریتی انداز میں بیان ملتا ہے۔ ساحر نے انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا اظہار جس ہنرمندی کے ساتھ اور معروضی طریقہ پر کیا ہے اور جس طرح اپنے عہد کے اقداری بحران کی تصویرکشی کی ہے۔ یہ بات ہمارے دور کے بہت کم شاعروں کے ہاں ملے گی۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے مناظر کو ذہن میں رکھیے، ان اشعار کی معنویت دہ چند ہو جائے گی ؎

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ مرحوم تیرے زندہ ارمانوں پہ کیا گزری
مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو اب بھی ہے
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری
یہ منظر کونسا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو، شبستانوں پہ کیا گزری

اور اس شعر میں آزادی کے بعد فسادات کی سمت کس بلاغت کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے ؎

زمیں نے خون اُگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غزلِ مسلسل کے ذیل میں آتی ہے جس میں موضوع کی وحدت، فکر کا ارتکاز اور مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں پر بیک نظر نظموں کا گمان ہوتا ہے۔ ساحر کی اور چند غزلوں کے تعلق سے بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ اس نظم سے ان کے مزاج کی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔

معاشرتی زندگی کے درد و کرب کو بھی ساحر نے اپنی غزلوں میں خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ساحر متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش بھی امیرانہ انداز سے ہوئی۔ ایک مختصر سی مدت کو چھوڑ کر انھوں نے خاصی آرام و آسائش کی زندگی گزاری، ٹھاٹ سے رہے لیکن معاشرہ کے آہ و کراہ، مصائب و آلام، الجھنوں اور پریشانیوں کو انھوں نے ایسے پیش کیا ہے جیسے یہ ان کا مشاہدہ ہی نہیں، ان کا احساس ہے، ان پر یہ سب کچھ بیتا ہے اور وہ ان پیچ و خم سے گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے بعض اشعار میں معاشرتی زندگی کی ان ناہمواریوں اور تلخیوں کو بہ تمام و کمال واضح کیا ہے۔ یہ اشعار ؎

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

ابھی نہ چھیڑ، محبت کے راگ اے مطرب!
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

وہی ظلم بارِ دگر ہے تو پھر
وہی جرم بارِ دگر کیجیے

موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بن باس میں بتائی گئی

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

ساحر کے ہاں اگرچہ ان کا اپنا کوئی فلسفہ نہیں لیکن انھوں نے بعض فلسفوں کا بلاشبہ بغور مطالعہ کیا جس کی ان کی شاعری سے عکاسی ہوتی ہے اس لیے ان کے بعض اشعار میں فلسفیانہ رنگ مل جاتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے ؎

جرأت انساں پر گو تادیب کے پہرے رہے
فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

اور اس شعر میں انسانی زندگی کے وجودی فلسفہ کی جھلک ؎

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

اردو غزل میں ناامیدی اور یاسیت کی فضا نسبتاً زیادہ ملتی ہے۔ ساحر کی غزل میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں لیکن ساحر بنیادی طور پر رجائیت پسند ہیں۔ انھیں انسان اور انسان کے جہد وعمل پر اعتماد اور اعتبار ہے۔ ان کے نزدیک آنے والا دور، خوشیوں، محبتوں اور مسرتوں سے معمور ہوگا، پُرنور اور جگمگاتا رہے گا۔ وہ اندھیروں سے گھبرانے والے نہیں۔ آس و اُمید سے کتنا معمور شعر ہے ؎

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

بیشتر ترقی پسند شاعروں نے غزل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ بعض نے تو اس کی مخالفت کی، اس کو رسوا کرنے کی کوشش بھی، لیکن فیضؔ، مخدومؔ اور ساحرؔ جیسے شاعروں نے غزل پر بھی توجہ دی اور اچھی غزلیں کہیں۔ ساحر کو بھی ان کی غزلوں کے کم سرمایہ کے باوجود کم از کم ترقی پسند غزل گو شاعروں میں ممتاز موقف کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔

ساحر فلمی دنیا میں

ساحر لدھیانوی کا فلمی دنیا میں آنے اور یہاں بطور نغمہ نگار زندگی گزارنے کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ انھوں نے بی۔اے کے لیے گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے وقت اپنی درخواست میں کھیلوں کے خانہ میں کرکٹ لکھا تھا۔ ہابی کے طور پر فوٹو گرافی اور بڑا ہو کر وکیل بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس کا نفسیاتی پس منظر شاید یہ ہو کہ لڑکپن میں اپنے والدین کے مابین مقدمہ بازی کے سلسلے میں انھیں عدالتوں میں آنے جانے اور وکلا کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اور عدالتوں میں وکلا کا جو رنگ ڈھنگ اور ان کی جو امتیازی شان اور حیثیت ہوتی ہے اس سے ساحر کو وکالت کے پیشہ میں کشش محسوس ہوئی ہو۔ بہرکیف ساحر خواہ کچھ بننا چاہتے ہوں، حالات نے انھیں کچھ اور بنا دیا ــــ

۱۹۴۴ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ ساحر نے ہر چند کہ اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا تھا لیکن اب تعلیم کا یہ سلسلہ ان کے مزاج سے ہم آہنگ محسوس نہ ہوتا تھا۔ یوں بھی اس دوران ادب اور سیاست سے ان کی دلچسپیاں زیادہ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ مزدوروں کے جلوسوں اور جلسوں میں شریک ہونے لگے تھے اور شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام بنتا جا رہا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ "تلخیاں" بھی اسی زمانے میں شائع ہوا۔ غرض ساحر نے تعلیم ترک کر دی۔ ترکِ تعلیم کے بعد انھوں نے اپنی پوری توجہ ادب اور سیاست پر صرف کی۔ چنانچہ وہ اپنے وقت کے معیاری اور تاریخ ساز جریدہ "ادبِ لطیف" کے مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوتے ہیں لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور ساحر

کسی روزگار کی تلاش میں تھے کہ ساحر کے ایک دوست نے ملک کی تحریکِ آزادی پر ایک فلم بنانے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے اپنی فلم کا نام رکھا "آزادی کی راہ پر"۔ ان دوست نے خواہش کی کہ ساحر ان کی فلم کے لیے گیت لکھیں۔ ساحر نے اس پیش کش سے فائدہ اٹھایا اور اس دوست کے ہمراہ ۱۹۴۵ء میں لاہور سے بمبئی آئے۔ بمبئی اس زمانے میں بھی ہندوستان کی فلمی دنیا کا مرکزِ قلب و نگاہ تھا۔ ساحر نے یہاں پہنچنے کے بعد پہلے سلیمان چیمبر میں قیام کیا پھر وارڈن روڈ پر منتقل ہوئے لیکن ساحر کو اس موقع پر فلمی دنیا میں ایسی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہاں جہاں تک ادبی دنیا کا تعلق ہے ساحر کو اپنی شعری و ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع ملے۔ ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کی صورتیں بھی کافی تھیں۔ یوں بھی بمبئی اس زمانے میں شاعروں اور ادیبوں کی کہکشاں تھی بلکہ یہاں ایسی کئی کہکشاں آباد تھیں۔ کرشن چندر، ساغر نظامی، اختر الایمان، کیفی اعظمی، ممتاز حسین، میراجی، شاہد لطیف، ممتاز مفتی، ظ۔ انصاری، مجروح سلطان پوری، حمید اختر، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، مدھو سدھن، وشوامتر عادل، نیاز حیدر، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور وغیرہ۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ سب فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ ان میں سے بعض کا تعلق صحافت سے بھی تھا اور بعض کسی اور سلسلے میں یہاں مقیم تھے۔ ان کے علاوہ مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، مجاز، جاں نثار اختر اور ابراہیم جلیس اگرچہ بمبئی میں مقیم نہیں تھے لیکن بمبئی اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ جوش ملیح آبادی جو فلمی صنعت سے وابستہ ہو کر پونے میں مقیم تھے ان کی بھی بمبئی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔ اردو کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کے بمبئی میں ہونے کا اثر پڑنا لازمی تھا اور اثر پڑا بھی — اب تک ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے جلسوں میں اردو، ہندی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں کے ادیب اور شاعر شریک ہوا کرتے تھے۔ اردو قلم کاروں کی بڑی تعداد کے باعث، اردو کا ایک علٰحدہ شعبہ قائم ہوا۔ جس میں اردو ہی کے فن کار شریک ہونے لگے اور اس شعبہ کے کنوینر حمید اختر مقرر ہوئے ترقی پسند مصنفین کے اردو قلم کاروں کے جلسے بڑی پابندی سے اور عموماً سجاد ظہیر کے مکان پر منعقد ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور مجاز کی منظومات زیادہ پسند کی جاتی تھیں۔ یوں ساحر کی ادبی مرتبت میں اضافہ

ہوتا رہا لیکن وہ فلمی دنیا میں مقام پانے کے لیے اپنی جد وجہد میں ہمہ تن لگے رہے۔ اسی دوران تقسیم ہند عمل میں آئی اور ملک کو آزادی ملی (۱۹۴۷ء)۔ ساحر اپنی ماں کی تلاش میں دہلی اور پھر پاکستان گئے۔ اس سلسلے میں پہلے باب میں تفصیل دی جا چکی ہے۔ پاکستان سے ماں کے ہمراہ واپس ہونے کے بعد ساحر جب بمبئی پہنچے تو صورتِ حال ان کے قطعی موافق نہیں تھی۔ ساحر کے اس دور کے حالات، ان کے دوست اور پرستار کرشن ادیب نے اپنی کتاب "ساحر، یادوں کے آئینہ میں" میں تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ ساحر، جو اب تک صبح گیارہ بجے تک سونے کے عادی تھے، بمبئی کے حالات کے باعث صبح سات بجے بستر سے اٹھ جاتے اور پھر لوکل ٹرینیں اور فلمی اسٹوڈیو کے چکر ـــــ کئی بار ایسا ہوا کہ ساحر کے بعض نغمے میوزک ڈائرکٹروں کی دھنوں پر گائے بھی گئے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے انھیں فلمایا نہیں گیا۔ یہ فلمی دنیا ہے ہی ایسی۔ اور پھر ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ بقول کرشن ادیب:

"یہ بھی سچ ہے کہ اُن دنوں اس (ساحر) نے کچھ گانے ضرور لکھے تھے جو ریکارڈ بھی ہوئے تھے لیکن ریکارڈ پر نغمہ نگار کے طور پر ساحر کے نام کی بجائے کسی دوسرے شاعر کا نام ہوتا۔ وہ شاعر ساحر کو پانچ سو روپے فی گانا دیتا۔"[۵]

وقت گزر رہا تھا لیکن ساحر کو ابھی اپنی منزل نہیں ملی تھی۔ ان کی جد وجہد جاری تھی۔ ڈیڑھ دو سال کا زمانہ گزر چکا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ساحر کی امی بھی بیزار ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں ان کی تجویز تو یہ تھی کہ فلمی دنیا میں یوں دوڑ دھوپ کرنے اور کامیابی سے دور رہنے کی بجائے ساحر الہ آباد (جہاں ان کے ماموں رہتے تھے) چلیں اور کوئی معیاری اور اچھا سا ادبی جریدہ شائع کریں لیکن ساحر نے مایوسیوں کے باوجود فلمی دنیا میں مقام پانے کے اپنے مقصد کو ترک نہیں کیا۔ وہ حالات سے دل برداشتہ کبھی نہیں ہوئے۔ انھوں نے زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن کو دیکھا لیکن اپنی دھن میں پکے رہے اور آخر ایک روز وہ اپنی منزل سے قریب تر ہوئے،

---

۵ کرشن ادیب "ساحر، یادوں کے آئینہ میں"، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۵ء پہلی بار ص ۳۰

انھوں نے اپنی منزل پالی۔

—— یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ میوزک ڈائرکٹر ایس۔ ڈی۔ برمن کا بڑا شہرہ تھا اور برمن نئی صلاحیتوں کی قدر کرنے میں مشہور تھے۔ کسی موقع پر پروڈیوسر موہن سہگل نے ساحر کو ایس۔ ڈی۔ برمن سے ملنے کا مشورہ دیا۔ وہ بڑی مبارک گھڑی تھی کہ ساحر نے برمن سے ملاقات کی۔ تھوڑی بہت گفتگو کے بعد برمن ساحر سے متاثر ہوئے اور اپنے قاعدے کے مطابق اپنے ایک گانے کی دھن اور سچویشن سمجھائی۔ برمن ہارمونیم پر دھن سجانے لگے اور ساحر نے یہ گانا لکھنا شروع کر دیا:

ٹھنڈی ہوائیں
لہرا کے آئیں
رت ہے حسیں
تم ہو کہیں
کیسے بھلائیں
ٹھنڈی ہوائیں

....

برمن کو گیت پسند آیا اور بات بن گئی لیکن یہ واقعہ بھی سن لیجیے جس سے اس دور میں ساحر کے ادبی مقام کا اندازہ ہوگا۔ ساحر کے گیت کو پسند کرنے کے بعد ایس۔ڈی۔ برمن، ساحر کو لے کاردار اسٹوڈیو چلے۔ غالباً وہ فلمی دنیا کو اپنی شاندار دریافت، ساحر سے متعارف کرانا چاہتے تھے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ساحر کے ادبی مرتبہ سے ایک دنیا واقف تھی اور غالباً بنگال کے رہنے والے ہونے کی وجہ سے برمن اس سے آگاہ نہ تھے۔ چنانچہ جب یہ دونوں کاردار اسٹوڈیو پہنچے تو شکیل بدایونی اور راجندر کرشن نے جو وہاں موجود تھے گرم جوشی سے ساحر کا استقبال کیا۔ بعد ازاں کاردار نے بھی۔ کاردار صاحب نے شکیل اور ساحر سے اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ بہر کیف اس طرح ساحر کو فلمی دنیا میں قدم جمانے کا موقع مل گیا، بہت اچھا موقع! ساحر اور برمن کی جوڑی نے رنگ جمایا، اور ایک مدت تک یہ دونوں اپنے وقت کے مقبول موسیقار اور نغمہ نگار رہے۔ ان دونوں کے بے شمار نغمے آج بھی

عوام کی زبان پر ہیں۔

ساحر کی مالی حالت اب اچھی ہو چکی تھی۔ انھوں نے کرشن چندر کے بنگلے کو چھوڑکر در سوا چنائی نواس میں سکونت اختیار کی اور اب وہ ایک موٹرکار کے مالک بھی ہو گئے تھے۔

فلم "بازی" سے ساحر کی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس فلم کو ایک اور زاویہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی بار موسیقار کے ساتھ نغمہ نگار کا نام بھی دیا گیا تھا۔ چنانچہ ساحر کا نام اس فلم میں نغمہ نگار کی حیثیت سے ملتا ہے۔

ساحر اور برمن کی کئی فلمیں باکس آفس پر ہٹ رہیں اور یہ دونوں نہایت کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ کسی بات پر ان دونوں میں نااتفاقی ہوئی۔ اختلافات بڑھے، یہاں تک کہ ساحر اور برمن نے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا۔ ساحر کا ساتھ اب او۔ پی۔ نیّر کے ساتھ ہوا۔ ان دونوں نے بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم "نیا دور" میں کام کیا۔ اس فلم کے نغموں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور ساحر کا نام چل نکلا۔ او۔ پی۔ نیّر سے بھی کسی بات پر ساحر کے اختلافات ہوئے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا پسند نہ کیا۔ اس میں دونوں کی تھوڑی بہت انانیت کو بھی دخل تھا۔ ہر دو یہ سمجھتے تھے کہ فلم کی کامیابی کا سہرا ان کے سر ہے۔ نیّر اپنی موسیقی پر نازاں تھے تو ساحر اپنے نغموں پر۔ برمن کے ساتھ ساحر کے کام نہ کرنے کی بھی ایک وجہ یہی بتائی جاتی ہے اور پھر ساحر کا یہ اصرار بھی تھا کہ وہ موسیقاروں سے بڑھ کر معاوضہ لیں گے۔ ایس۔ ڈی۔ برمن اور او۔ پی۔ نیّر سے زیادہ معاوضہ ساحر کو دینا پروڈیوسروں کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ یہ صفِ اوّل کے موسیقار تھے اور ان کا معاوضہ خاصا ہوتا تھا۔ پروڈیوسر، ساحر کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انھیں ساحر کی مقبولیت کا اندازہ تھا۔ لہٰذا ہوا یہ کہ نسبتاً کم معروف اور نئے موسیقاروں کے ساتھ ساحر نے نغمہ نگاری شروع کی۔ اس طرح ساحر کا مطالبہ بھی پورا ہوا کہ انھیں موسیقاروں سے بڑھ کر معاوضہ ملنے لگا اور ایس۔ ڈی۔ برمن اور او۔ پی۔ نیّر کے ساتھ کام نہ کرنے کی ضد بھی پوری ہوگئی۔ ساحر کو اس کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اپنی ذات پر ان کا اعتماد بڑھا کہ کم مقبول اور نئے موسیقاروں کے ساتھ

کام کر کے انھوں نے فلموں کو جہاں تجارتی طور پر کامیابی سے ہمکنار کیا وہیں اپنے نغموں کو فنی اور ادبی معیاروں کا حامل بھی رکھا۔ ایسے موسیقاروں میں روی، این دتہ، خیام اور جے۔ دیو وغیرہ کے نام لائقِ ذکر ہیں۔ ان موسیقاروں کے ساتھ ساحر کی کئی فلمیں کامیاب ہوئیں اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ زیادہ تر نئے موسیقاروں کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے معروف ہوگیا کہ ساحر فلمی دنیا میں نئے موسیقاروں کو روشناس کراتے ہیں۔

ساحر نے جب فلمی زندگی اختیار کی تو بیشتر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو مناسب معلوم نہیں ہوا۔ ساحر کے اس رویّہ پر تنقید کی جانے لگی کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ فلمی دنیا میں آنے کے بعد ادیب اور شاعر صرف دولت کمانے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ عوام سے ان کا رابطہ برقرار نہیں رہتا اور ان کا فن بھی معیار سے گر جاتا ہے۔ یہ بات زیادہ نہیں تقریباً تمام شاعروں کے بارے میں درست ہے لیکن ساحر کے تعلق سے صورتِ حال قطعی برعکس رہی!

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساحر نے ابتداءً فلمی دنیا کے روایتی اور ٹائپ شاعری سے ملتی جلتی شاعری کی لیکن یہ بس ایک محدود عرصہ کے لیے۔ انھیں جب فلمی دنیا میں اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا تو انھوں نے اپنی پسند کے مطابق فلموں کا انتخاب کیا اور صرف فلم بینوں کی دلچسپی اور پروڈیوسروں اور فینانسروں کی دلجوئی کی سعی نہیں کی، بلکہ فلم کو اپنے خیالات اور افکار کے وسیلہ کے طور پر بھی استعمال کیا۔ یہ وہ زاویے تھے جن کا تاحال فلمی دنیا میں وجود نہیں تھا۔ آرزو لکھنوی کے علاوہ جن کے فلمی نغمے فنی اور ادبی معیارات کے حامل تھے اور ساحر بھی جن کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے، فلمی شاعروں میں شاید ہی کوئی اور ہو جس نے فن اور ادب سے واسطہ رکھا ہو۔ جاں نثار اختر بھی ایک استثنا ہیں جن کے فلمی نغموں میں فنی اور ادبی قدریں قابلِ لحاظ ملتی ہیں لیکن ظاہر ہے جاں نثار اختر کا فلمی نغموں کا سرمایہ ایسا زیادہ نہیں۔

فلمی دنیا میں زمانۂ دراز تک فلمی گیتوں کا معیار خاصا پست تھا بلکہ کوئی معیار ہی نہیں تھا۔ لوگ محض تُک بندی کر لیتے تھے۔ تہذیبی اور معاشرتی تقاضوں کو بھی عموماً نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ جذبات رکیک اور تیسرے درجے کے ہوتے تھے

اور ان کا اظہار بھی ایسی ہی سطح سے کیا جاتا تھا۔ ساحر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلمی نغمہ نگاری کو ایک نیا موڑ دیا۔ فلموں کے لیے ساحر نے گیت، دوہے، نظمیں، غزلیں اور قوالیاں، سب لکھیں لیکن ہر ایک میں اپنا معیار برقرار رکھا کہ ان کے نغمے فلموں کی کامیابی کی ضمانت ہوتے اور فلمیں تجارتی اور مالی طور پر بھی کامیاب ثابت ہوئیں۔ ساحر نے فلموں کے لیے "رات بھر کا ہے مہماں سویرا"، "تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا"، "وہ صبح کبھی تو آئے گی"، "جائیں تو جائیں کہاں"، "عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا" اور "ساتھی ہاتھ بڑھانا" جیسے بے شمار شاہکار نغمے دیے جو آج بھی سیکڑوں افراد کے کانوں میں گونجتے، ان کے حافظے میں محفوظ اور ان کے لبوں پر مچلتے ہیں۔ غرض یہ کہ ساحر نے فنی اقدار اور ادبیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور ان افراد کو خاموش کر دیا جو یہ سمجھتے تھے کہ فلمی دنیا سے وابستہ رہ کر ساحر کے نغموں کی ادبیت مجروح ہو جائے گی۔ اس ایک گیت سے اندازہ ہوگا ؎

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے، عبادت کا ارادہ ہے
جو دل کی دھڑکنیں سمجھے، نہ آنکھوں کی زباں سمجھے
نظر کی گفتگو سمجھے، نہ جذبوں کا بیاں سمجھے
اسی کے سامنے اس کی شکایت کا ارادہ ہے
کسی پتھر کی مورت سے ....
سنا ہے ہر جواں پتھر کے دل میں آگ ہوتی ہے
مگر جب تک نہ چھیڑو شرمگیں پردے میں سوتی ہے
یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے روبرو کہہ دیں
نتیجہ کچھ بھی نکلے آج اپنی آرزو کہہ دیں
ہر اک بے جا تکلف سے بغاوت کا ارادہ ہے
کسی پتھر کی مورت سے ....

اور یہ دیکھیے عام فلمی گیتوں سے تقابل کریں تو یہ شاید فلمی گیت ہی محسوس نہ ہو لیکن ہے یہ فلم ہی کا گیت ۔ فلم کا نام ہے " مجھے جینے دو " کس قدر ادبیت ہے اس میں ۔ بے مثال منظر نگاری اور تشبیہات کا استعمال نکھرا ہوا ہے

رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی
چاند بھی ہے کچھ مدھم مدھم
تم آؤ تو آنکھیں کھولے
سوئی ہوئی پائل کی چھم چھم

تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم
جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے رک کر، تھم تھم

ساحر کو منظر نگاری میں بھی بڑا کمال حاصل تھا ۔ انھوں نے فطرت کا جس گہری نظر اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اس کا اظہار ان کے ایسے نغموں میں ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنے منفرد انداز میں نغمہ نگاری کی ہے ۔ قلم کے جادو کی داد دینی پڑتی ہے کہ منظر نظر کے سامنے متحرک ہو جاتا ہے بلکہ ذرا اور توجہ سے کام لیں تو ہم منظر میں کھو جاتے ہیں بلکہ منظر کا ایک حصّہ بن جاتے ہیں ۔ فلم " شگون " کا یہ نغمہ ملاحظہ کیجیے جس کے موسیقار تھے خیام ؎

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سُرمئی اجالا ہے ، چمپئی اندھیرا ہے

دونوں وقت ملتے ہیں دو دلوں کی صورت میں
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے

ٹھہرے ٹھہرے پانی پر گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے

ساحر منظر نگاری کرتے ہوئے ایک رومانی اور کیف پرور فضا تخلیق کر دیتے ہیں اور جہاں وہ خالص رومانی شاعری کرتے ہیں وہاں تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ نغمات کو سننے اور پڑھنے والے لطف و رنگ کی فضا میں اپنی ذات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ فلمی دنیا میں رومانی نغمے یوں تو کئی شاعروں نے لکھے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر سطحی اور سستے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ساحر کے رومانی نغموں میں جذبات کی پاکیزگی عشق و محبت کا تقدس اور شعری و ادبی اعلیٰ معیارات ملتے ہیں۔ ایک رومانی نغمے کے یہ اشعار ؎

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی ہو جو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ، یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو

ایک اور رومانی نغمہ جس میں رومان کی چاشنی، زبان و بیان کی روانی اور فنی اصولوں کی پاسداری پائی جاتی ہے۔ کتنا سیدھا سادا لیکن کیسا متاثر کن نغمہ ہے ؎

یہ وادیاں، یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمھیں
خموشیوں کی صدائیں بلا رہی ہیں تمھیں
ترس رہے ہیں جواں پھول ہونٹ چھونے کو
مچل مچل کے ہوائیں بلا رہی ہیں تمھیں
تمھاری زلفوں سے خوشبو کی بھیک لینے کو
جھکی جھکی سی گھٹائیں بلا رہی ہیں تمھیں
حسین، چمپئی پیروں کو جب سے دیکھا ہے
ندی کی مست ادائیں بلا رہی ہیں تمھیں
مرا کہا نہ سنو، ان کی بات تو سن لو
ہر ایک دل کی دعائیں بلا رہی ہیں تمھیں

رومانی کیفیات کے سلسلے میں عالمِ ہجر کا اظہار ایک اہم پہلو ہے۔ لگ بھگ ہر فلم میں ایک آدھ نغمہ ایسا مل جاتا ہے جس میں چاہنے والے جدائی کے کرب کا اظہار کرتے ہیں لیکن بسا اوقات یہ گیت معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہمارے تہذیبی تقاضوں کے منافی بھی، جن میں نہ تو جذبات کی پاکیزگی پر توجہ دی جاتی ہے اور نہ الفاظ کے انتخاب اور مصرعوں کے دروبست پر اور نہ پیرایۂ اظہار سے فنکاری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے برعکس ساحر نے جب بھی ایسے مواقع کے لیے گیت لکھے ہیں، انھوں نے جذبات کی پاکیزگی اور الفاظ کی خوبصورتی کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ الفاظ سیدھے سادے، سُریلے اور سہل استعمال کرتے ہیں لیکن تاثر ان کے نغموں کا اہم عنصر ہوتا ہے۔ اردو کی لطافت اور شیرینی، حسن اور نزاکت کو وہ اپنے نغموں میں سمو لیتے ہیں۔ فلم مکان ۱۹۴۴ کا یہ گیت جس کے موسیقار ایس۔ڈی۔ برمن ہیں، میں ہجر کی کیفیات کی ترجمانی کی گئی ہے، کسی ادبی شہ پارے سے کم نہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں
آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں
چاند مدھم ہے، آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

اور یہ ایس۔ ڈی۔ برمن کی موسیقی پر فلم "ٹیکسی ڈرائیور" کا گیت ہے۔ فنی پختگی لیا ہوا، اونچے ادبی معیار کا حامل اور پھر شستگی اور شائستگی میں بھی اپنی مثال آپ، ملاحظہ ہو ؎

ان کا بھی غم ہے اپنا بھی غم ہے
اب دل کے بچنے کی امید کم ہے
اک کشتی، سو طوفاں
جائیں تو جائیں کہاں

جہاں تک تغزل کا تعلق ہے۔ ساحر کے بیشتر گیت تغزل سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ساحر نے غزلیں کم کہی ہیں لیکن ان کے ہاں تغزل، غزل کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے ان کی نظموں اور نغموں کو بھی آباد کر گیا ہے۔ تغزل کا تعلق آورد سے نہیں، آمد سے ہوتا ہے۔ یہ کوئی ارادی نہیں، غیر ارادی عنصر ہے۔ جذبہ کی شدت، محسوسات کی ندرت اور اخلاص کے نکھار سے تغزل کی فضا تخلیق ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ زبان کا فطری قادرانہ استعمال تو از بس ضروری ہے۔ ساحر کے گیت، نغمے یوں بھی تغزل سے معمور اور رنگین ہوتے ہیں۔ یہ دو اشعار ؎

تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمھیں ان کی قسم یہ دکھ یہ حیرانی مجھے دے دو
میں دیکھوں تو سہی، دنیا تمھیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے ان کی نگہبانی مجھے دے دو

ایک اور گیت جس میں تغزل، نکھرے ہوئے بانکپن کے ساتھ ملتا ہے۔ فلم کا نام ہے "پیاسا" اور موسیقار ایس۔ ڈی۔ برمن۔ یہ مصرعے:

آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں
ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں پہ ہیں انگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں

عشق مجازی تو ساحر کے نغموں میں ہے ہی لیکن انھوں نے عشق کو ایک اور وسیع کینوس میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ یہ عشق حقیقی کا تصور ہے۔ صوفیا اور اہل اللہ کے نزدیک عشق کی واقعیت یہی ہے۔ روحِ عشق یہی ہے، عشق کا منصب اور عشق کا کردار یہی ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ بھی ایک فلمی نغمہ ہے:

اللہ اور رسول کا فرمان عشق ہے
یعنی حدیث عشق ہے قرآن عشق ہے
گوتم اور مسیح کا ارمان عشق ہے
یہ کائنات عشق ہے اور جان عشق ہے

ساحر نے اور فلمی شاعروں کے برعکس فلمی نغموں میں سیاسی اور سماجی مسائل اور عوام کے دکھ درد کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مزدوروں، محنت کشوں اور کسانوں کے جذبات کی عکاسی کی۔ محنت کے استحصال اور جاگیرداری، سرمایہ داری اور زمینداری کے ظلم وستم کی تصویریں پیش کیں، لاوارث بچّوں کی آواز اور عورتوں کی بے بسی کی انھوں نے مرقع کشی کی۔ اس طرح ساحر نے جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے فلم کے میڈیم کو ایک اچھے، عالی اور انسانیت دوست مقصد کے لیے استعمال کیا۔ ساحر ہر چند کہ فلمی دنیا میں آنے سے قبل ہی ایک انفرادی ادبی مرتبت کے مالک ہو چکے تھے لیکن فلمی دنیا میں آنے کے بعد اپنے ایسے نغموں سے انھوں نے اپنے ادبی موقف کو نہ صرف بحال رکھا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ فلمی دنیا میں آنے کی وجہ سے ساحر ادبی اور رسائلی شاعری کے لیے اتنا وقت اور اتنی توجہ نہیں دے سکتے تھے جس کا تقاضا تھا اس لیے انھوں نے اپنے فلمی نغموں ہی کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا اور نہ صرف ادبی اقدار سے فلمی شاعری کو ہم آہنگ کر دیا بلکہ سیاسی اور سماجی مسائل کو پیش کرنے کی گنجائش بھی نکال لی۔ ساحر نے ایک جگہ لکھا بھی ہے:

"میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو فلمی نغموں کو تخلیقی شاعری کے قریب لا سکوں اور اس صنف کے ذریعہ جدید سماجی اور سیاسی نظریے عوام تک پہنچا سکوں۔"[۵]

ساحر کی فلمی شاعری سے ان کے اس دعوئ کی توثیق بھی ہوتی ہے۔ دیکھیے کیسے

---

[۵] "گاتا جائے بنجارہ" ص ۱۲

اشاریتی اور دلنواز پیرایہ میں وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں ؎

رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا
رات جتنی بھی سنگین ہو گی
صبح اتنی ہی رنگین ہو گی
غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

اور ان دو بندوں کا تو جواب نہیں۔ عصری زندگی کی تلخیوں کو کیسی فنکاری کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ گھناؤنے معاشرے کے چہرے سے نقاب کیسے اٹھائی گئی ہے ؎

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہو
ہر اک جسم گھائل، ہر اک روح پیاسی
نگاہوں میں الجھن، دلوں میں اداسی
یہ دنیا ہے یا عالمِ بد حواسی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہو

غمِ زمانہ کو اجاگر کرتے ہوئے ایسے اشعار بھی دیکھیے ؎

کس لیے جیتے ہیں ہم، کس کے لیے جیتے ہیں؟
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

ساحر کی فلمی شاعری کے اسی رُخ کو ملحوظ رکھتے ہوئے جاں نثار اختر نے بجا طور پر لکھا ہے:

" ساحر کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے فلموں کو ایسے گیت دیے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں۔ یہ ایک بڑا قدم ہے جو ساحر نے بڑی دلیری سے اٹھایا۔ وہ ہمارے بعض دوسرے شاعروں کی طرح فلمی دنیا کی گندگی میں ڈوب کر نہیں رہ گیا بلکہ اس نے اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو اگر ایک طرف حسن کی لطافت اور نزاکت اور عشق کا درد اور کسک بخشی تو دوسری طرف سماجی، مادی اور اقتصادی شعور دیا۔" [لے]

اس خصوص میں یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے کہ جو ادبی اور فنی زاویوں سے ایسے بلند معیار ہیں کہ کسی بھی شعری انتخاب میں ان کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ ان اشعار کی معنوی تہہ داری بھی توجہ چاہتی ہے ؎

جو مل گیا اسی کو مقدّر سمجھ لیا
جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا

موت کتنی بھی سنگ دل ہو مگر
زندگی سے تو مہرباں ہو گی

تم مجھے بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو
مری بات اور ہے میں نے تو محبّت کی ہے

موت سے اور کچھ ملے نہ ملے
زندگی سے تو جان چھوٹے گی

ساحر کی زندگی جہد و عمل سے عبارت رہی ہے۔ فلمی دنیا میں اپنا مقام پانے کے لیے انھوں نے ہزار صعوبتیں سہیں، مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کیا اور آخر کار اپنی منزل کو پایا۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کے ذریعہ بھی عزم و ہمت کے پیام کو عام کیا۔ ترقی پسند رجحانات بھی ان کے کام آئے اور انھوں نے دلوں کو بڑھانے، عزائم کو بیدار کرنے اور نئے دریچے کھولنے کے لیے عوام کو

[لے] " فن اور شخصیت " ساحر لدھیانوی نمبر، ص ۳۹۸

تحریک دی۔ یہ گیت پڑھیے ؎

ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں؟
انصاف ترے ساتھ ہے الزام اٹھا لے
ٹوٹے ہوئے پتوار ہیں کشتی کے تو کیا غم
ہاری ہوئی بانہوں کو ہی پتوار بنا لے

ساحر نے موضوع اور مواد کے ساتھ موثر پیرایۂ اظہار کو بھی اہمیت دی اور اس کے لیے جہاں ضروری بھا ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا۔ ان کے نغموں کو عام مقبولیت حاصل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ عام مقبولیت نے ساحر کی خوداعتمادی کو محکم کیا۔ ساحر سے قبل کسی فلمی شاعر نے اپنے نغموں اور گیتوں کو کتابی صورت میں شائع نہیں کیا تھا۔ ایسا شاید کسی کے ذہن میں آیا بھی نہ ہو کیونکہ اوروں کے یہاں اتنی فنی پختگی اور فنی معیارات کی پاسداری نہیں ملتی لیکن ساحر نے فلمی نغموں کو معیاری ادبی منظومات کا درجہ دے دیا تھا چنانچہ انھوں نے اپنے فلمی نغموں کا مجموعہ "گاتا جائے بنجارہ" شائع کیا، جو اپنے اونچے معیار کی گواہی آپ خود دیتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ تا حال اس کے دو درجن کے لگ بھگ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ناگری (ہندی) اور گورمکھی (پنجابی) رسم خط میں بھی "گاتا جائے بنجارہ" کی کئی اشاعتیں عمل میں آچکی ہیں۔ "گاتا جائے بنجارہ" کا فلمی اور ادبی دونوں حلقوں میں خیر مقدم کیا گیا۔ خود ساحر کی شعری شخصیت کو بھرپور اور معتبر بنانے میں اس مجموعہ کا غیر معمولی حصّہ رہا۔ چنانچہ قمر اجنالوی نے "گاتا جائے بنجارہ" کے بارے میں بالکل درست لکھا ہے کہ:

"گاتا جائے بنجارہ" کے نام سے اس کے فلمی گیت کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان گیتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فلم کا ساحر نہیں ترقی پسند تحریک کا ساحر اپنے تمام شعری محاسن، مخصوص الفاظ و تراکیب اور نظریہ کی لگن کے ساتھ ان میں رچا بسا ہوا ہے۔ فلمی دنیا میں اسے جو عروج ملا شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہو سکے۔ بڑے بڑے

پروڈیوسر، ڈائرکٹر اس کے پیچھے پیچھے پھرتے، خوشامدیں کرتے اور اس کی خوشنودی کے طالب رہتے تھے مگر وہ گیت اپنی مرضی سے لکھتا اور معاوضہ ٹھوک بجا کر لیتا تھا۔ ایک فلم کے گیتوں کا ایک لاکھ روپے معاوضہ ساحر ہی کے حصّہ میں آیا۔" ؎

یوں ساحر نے فلمی نغموں کے وزن و وقار کو افزوں کیا اور اپنی امتیازی حیثیت منوائی تو اسی کے ساتھ فلمی دنیا کی اور خدمات بھی انجام دیں۔

ساحر کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فلم کی کامیابی میں گیت کاروں کی اہمیت منوائی اور ان کے مقام کو معتبر کیا۔ تا حال ہوتا یہ تھا کہ موسیقار دھن تیار کرتے تھے اور گیت کار اس دھن کی بنیاد پر گیت لکھتے تھے، اور فلموں کی کامیابی موسیقاروں کی دھنوں کی مرہونِ منت قرار دی جاتی تھی۔

ساحر نے اس نکتہ کی وضاحت کی کہ گیت کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ تسلیم کہ موسیقار کی تیار کردہ دھن دل کش ہوتی ہے لیکن اگر نغمہ بے جان ہو تو سارا کرا کرایا ختم ہو سکتا ہے اس لیے اچھے نغموں اور اچھے نغمہ نگاروں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ساحر نے اپنے نغموں کی وقعت کو یوں بھی منوایا کہ بڑے موسیقاروں کے ناز نخرے نہیں سہے اور نسبتاً غیر معروف بلکہ نئے موسیقاروں کے ساتھ نغمے لکھے اور ایسے کہ نہ صرف یہ نغمے مقبول ہوئے بلکہ ان کی وجہ سے فلمیں بھی باکس آفس پر کامیاب رہیں۔ یوں جب نغمہ نگاروں کی اہمیت تسلیم کی گئی تو ساحر نے جب کہ وہ فلم رائٹرس اسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے، ایک اور حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی۔ تا حال ہوتا یہ تھا کہ ریڈیو سے فلمی گانوں کے نشر کے وقت اناونسر گلوکار اور موسیقار کا نام تو لیتے تھے شاعر کا نام نہیں لیتے تھے۔ ساحر نے ریڈیو کے اربابِ اقتدار سے اپنے موقف کو منوایا اور نغمہ کے ساتھ شاعر کے نام کا بھی اعلان کیا جانے لگا۔ اسی کے ساتھ فلم کے ٹائیٹل وغیرہ بتاتے وقت اسکرین پر موسیقار اور گلوکار کے نام تو آتے تھے لیکن شاعر کا نام نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ساحر کی

؎ "فن اور شخصیت" ساحر لدھیانوی نمبر، ص ۱۲۵

کوششوں سے شاعر کا نام بھی اسکرین پر دیا جانے لگا۔ یہ وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے ساحر کی مرتبت تو روز افزوں ہوئی ہی، دیگر نغمہ نگاروں میں بھی خود اعتمادی اور خود اعتباری پیدا ہوئی اور وہ بھی اپنے آپ کو صاحبِ حیثیت تصوّر کرنے لگے۔ اور پھر یہی نہیں، ساحر نے اپنی زبان اردو کے لیے بھی لڑائی لڑی اور اردو فلموں کے لیے سنسر بورڈ سے اردو سرٹیفکیٹ کے حصول کی جدوجہد کی اور بسا اوقات کامیاب رہے۔

فلمی دنیا میں نغمہ نگار ہیں، پہلے بھی تھے اور آئندہ ہمیشہ رہیں گے لیکن جن نغمہ نگاروں نے اپنی تاریخ بنائی وہ بالکل کم ہیں اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ساحر واحد نغمہ نگار ہیں جنھوں نے فلمی دنیا کو ایک نیا موڑ، نیا رنگ، نیا عنوان اور نیا مستقبل دیا لیکن جیسا کہ ساحر کی ماموں زاد بہن انور بی بی کا کہنا ہے، ساحر کو فلمی دنیا ایسے پسند نہ تھی۔ وہ شاید یہ زندگی ترک کر دینا چاہتے تھے۔ انور بی بی کے الفاظ میں:

"روزگار کی تلاش میں وہ اس لائن میں ضرور آ گئے تھے مگر اس سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں وہ فلمی دنیا سے علٰحدگی کا اعلان بھی کرنے والے تھے مگر اس سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے چلے گئے۔" [۵]

بہر کیف کچھ ہو حالات نے ساحر کو فلمی دنیا میں رکھا اور اسی دنیا میں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ فلمی دنیا میں شاعروں اور ادیبوں کے وقار کو بلند کیا، خود فلمی دنیا کو بھی ایک معیار عطا کیا۔ ادبی دنیا میں تو ساحر کا موقف ہے ہی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلمی دنیا بھی ساحر کو فراموش نہیں کر سکتی۔ ساحر فلمی دنیا کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔

---

[۵] "فن اور شخصیت" ساحر لدھیانوی نمبر، ص ۵۴

ساحر کا اسلوبِ شاعری

ترقی پسند شاعروں میں ساحر کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ہمارے ہاں کئی شاعروں کا عوام سے گہرا ربط رہا ہے۔ انھوں نے عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو سنا۔ کسانوں کی شب و روز کی مشقت کو دیکھا، محنت کشوں کے پسینے کو محسوس کیا، اور مزدوروں کی سخت کوشی پر ترس کھایا ۔۔۔ ساحر بھی جب تک لدھیانہ میں رہے انھوں نے مزدور تحریکات میں حصہ لیا اور بمبئی میں ان کے قیام کے ابتدائی زمانے کا ایک حصہ مزدور بستیوں میں گزرا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آگے چل کر عوام سے ان کا ربط منقطع ہو گیا۔ ہاں صرف زاویہ بدل گیا بلکہ فلم جیسے میڈیم کی وجہ سے وہ عوام سے اور زیادہ قریب ہو گئے۔ عوام کے مزاج و مذاق، دکھ سکھ، دلچسپیوں اور بیزاریوں اور حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس و ادراک کیا اور ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل کے لیے اپنے نظریات کی ترسیل کی۔ عوام سے ربط کی وجہ سے اور ویسے اس میں ان کے مزاج کو بھی دخل تھا۔ ساحر نے ابہام و اشکال سے کام نہیں لیا۔ ان کے ہاں اشاریت بھی ایسے نہیں ملتی۔ وہ جو تشبیہات اور استعارات ملتے ہیں نہایت ہلکے پھلکے، سادہ اور سہل اور عام زندگی سے تعلق رکھنے نیز عام انسان کی فہم کی زد میں آجانے والے بھی۔ ساحر کی شاعری کی مقبولیت کے وجوہ اور جو بھی ہوں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم کسی اور سے نہیں، اپنے آپ سے گفتگو کر رہے ہیں، اپنی شاعری آپ سن رہے ہیں۔

ساحر کی شاعری، فراق، ہجر اور محبوب سے جدائی کی شاعری ہے۔ بلکہ یہ کہنا

زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ محبوب کے نہیں محبت کے شاعر ہیں لیکن ایسے میں وہ زیادہ جذباتی نہیں ہوتے۔ محبوب کی جفاؤں کا رونا نہیں روتے۔ ان کے ہاں واسوخت کا انداز نہیں پایا جاتا بلکہ وہ محبوب کی مجبوریوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اردو شاعری کے روایتی انداز سے ہٹ کر اپنی طرز نکالتے۔ نہایت دھیمے، سلونے اور خوشگوار اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلوب کا یہ دھیماپن اور یہ خنکی، ساحر ہی کا حصہ ہے کہ ان کے الفاظ وغیرہ ہی سے نہیں ان کے اسلوب سے بھی ان کی محبت کی پاکیزگی، ان کے جذبات کی سچائی، محسوسات کے اخلاص اور محبوب کے تعلق سے ان کی فریفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا انداز اتنا ملایم، اتنی آہستگی لیے ہوتا ہے کہ بس یہی لگتا ہے کہ یہ آواز ان کے دل سے اور صرف ان کے دل سے آرہی ہے۔ سب سے پہلے یہ مصرعے، اگرچہ ایک فلمی گیت کے ہیں لیکن نہ کہا جائے تو شاید احساس ہی نہ ہو کہ یہ تو اپنے طور پر معیاری ادب پارہ معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں
ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں پہ ہیں انگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں

ساحر اپنے اسلوب کی نیرنگی سے حسن وعشق کی ایک بھینی بھینی مہکتی مہکاتی اور چاروں سمت نغمہ ونور برساتی فضا تخلیق کردیتے ہیں کہ خود قاری بھی اس دنیائے رنگ وبو میں کھوجاتا ہے۔ واقعی ساحر کی سحرکاری کی داد دینی پڑتی ہے نظم "کبھی کبھی" کے یہ اشعار ؎

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کبھی

تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لیے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں میں
سمٹ رہی ہے تو شرما کے میری باہوں میں
یہ جانتا ہوں کہ تو غیر ہے مگر پھر بھی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

اور پھر ایسے ہی دل میں اتر جانے والے اسلوب کا ایک اور شہ پارہ نظم '' آؤ کوئی خواب بنیں'' کے یہ دو بند ؎

زلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
معراجِ فن کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
تہذیبِ زندگی کے، فروغِ وطن کے خواب
زنداں کے خواب، کوچۂ دار و رسن کے خواب
یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب مر گئے تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہہ سنگ ہے حیات

اسلوب ہی کے یہ جادو جگاتے انداز ساحر کی کئی نظموں میں مل جاتے ہیں۔ ان کی معروف نظم '' پرچھائیاں'' میں تو جگہ جگہ ان کے اسلوب کی ندرت اور کرشمہ کاریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس غیر معمولی نظم کے پہلے ہی بند کے یہ اشعار اسلوب کی دل کشی اور دلآویزی کی اپنی مثال آپ ہیں ؎

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح

حسیں پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسیں ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت، کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

ساحر کے اسلوب میں ایک تنوع کی طرفگی اور ایک طرح کا تنوع پایا جاتا ہے۔ جہاں وہ خوشگوار، حسین اور سرشار ماحول تخلیق کرتے ہیں اور ان کے ہاں ایک خنکی اور من موہنی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ موضوع کی مناسبت سے ان کے لہجہ میں ایک تندی اور تلخی بھی در آتی ہے لیکن قاری کے لیے یہ کیفیت بارِ گراں نہیں ہوتی۔ مخدوم محی الدین کے ہاں بھی یہی شعری اسلوب ملتا ہے۔ چونکہ موضوع اس کا متقاضی ہوتا ہے اس لیے مجموعی طور پر یہ اسلوب اپنی تاثیر میں دوچند ہو جاتا ہے۔"
"کسی کو اداس دیکھ کر" کے یہ اشعار ؎

یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
یہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رُو بچے

یہی بھوکے بھکاریوں کی صدا، افلاس اور بھوک کا شور، انسانیت کی آہ و بُکا، غریبوں کے بے کفن لاشے اور ان کے زرد رُو بچّے ہیں جن سے جذباتی وابستگی نے ساحر کی شاعری اور ان کے شعری اسلوب کو نکھارا اور ایک نیا رنگ دیا ہے، ایک درد و غم کی کیفیت کو سمو دیا ہے اور ایک تیکھا پن ان کے ہاں در آیا ہے اور مختصر یہ کہ ان کے اسلوب میں ایک احتجاج کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

اردو میں احتجاجی شاعری ابتدا سے ملتی ہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف ہمارے کلاسیکی شاعروں نے غیر معمولی اور پُر اثر اشعار کہے ہیں، اس خصوص میں منظومات بھی مل جائیں گی۔ ساحر کے ہاں بھی احتجاجی لب و لہجہ اور احتجاجی اسلوب ہے جو عام طور پر نعرہ بازی اور سطحیت سے دور اور ہماری تہذیبی اقدار کے امتزاج کا حامل ہے۔ اور یہ کوئی اوڑھا ہوا اور اختیار کردہ نہیں بلکہ فطری اور ساحر کی شخصیت کا جزو ہے۔ ساحر کے شعری مجموعوں (بشمول فلمی نغموں کے مجموعہ "گاتا جائے بنجارہ") کا مطالعہ کیا جائے تو اس نوعیت کی کئی منظومات مل جائیں گی۔ ساحر کے موضوعات اور ان کے رچے ہوئے ادبی اور فنی رویّہ کے باعث، ان کا یہ احتجاجی اسلوب سلجھا ہوا اور وقیع انداز لیے ہوتا ہے۔ میں یہاں ان کی ایسی منظومات کے عنوانات بھی گنا تا چلوں تو فہرست کافی طویل ہو جائے، بس چند ناموں پر اکتفا کروں گا جیسے "احساسِ کامراں" "یہ کس کا لہو ہے" "آوازِ آدم"، "خون پھر خون ہے"، "جشنِ غالب"، "گاندھی اور غالب" "قحط بنگال" اور ان کی معرکہ آرا نظم "پرچھائیاں" اور "چکلے" وغیرہ۔ یہاں "پرچھائیاں" کے یہ دو بند ؎

اٹھو کہ آج ہر اک جنگجو سے یہ کہدیں\
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے\
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں\
ہمیں تو اپنی زمیں پہ ہلوں کی حاجت ہے

کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رُخ نہ کرے\
اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی\
یہ کھیت جاگ پڑے اٹھ کھڑی ہوئی فصلیں\
اب اس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

ساحر کے ہاں اگرچہ ایسی کوئی نظم نہیں ملتی جس میں یہ کیفیت از اول تا آخر جاری و ساری ہو لیکن ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" میں صوتی آہنگ کی فضا اور موسیقیت زیادہ ملتی ہے۔ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

انسان کی قیمت گرنے لگی — اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے

چوپال کی رونق گھٹنے لگی — بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے

بستی کے سجیلے شوخ جواں — بن بن کے سپاہی جانے لگے

جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے — اس راہ پہ راہی جانے لگے

ان جانے والے دستوں میں — غیرت بھی گئی برنائی بھی

ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے — بہنوں کے چہیتے بھائی بھی

بستی پہ اداسی چھانے لگی — میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں

آموں کی لچکتی شاخوں سے — جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں

اس صوتی آہنگ کے باعث ساحر کے کلام میں ایک دل موہ لینے والی غنائیت سے سامنا ہوتا ہے۔

ساحر کا اردو شاعری کی روایات اور کلاسیکی اقدار سے گہرا رشتہ ہے۔ انھوں نے آزاد اور معریٰ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی پابند نظموں اور غزلوں کی تعداد کافی ہے جن پر ہماری کلاسکس اور شعری روایات کی چھاپ بیک وقت محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان یہاں وہاں اس کی غمازی بھی کرتا ہے اس

سلسلے میں ان کی کئی منظومات ہیں مثلاً" یکسوئی"، "طرحِ نو"، "مفاہمت" اور "گریز" لیکن ان کی غزلوں پر کلاسکس کی چھاپ اور واضح ہے۔ غزل ہے بھی ایسی صنف کہ اس نے لاکھ چولے بدلے ہوں لیکن بنیادی طور پر غزل رہی ہے، اپنی روایات سے گہرے طور پر جڑی ہوئی۔ ساحر کی غزل بھی انہی روایات کی امین ہے۔ ان کے ہاں بعض غزلیں تو از اوّل تا آخر کلاسکی رنگ کی حامل ہیں، مثلاً جن کے پہلے مصرعے ہیں:

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں

ساحر کے کلام پر جہاں کلاسکی اقدار اور اقبال کا اثر محسوس کیا جا سکتا ہے اپنے ہم عصروں میں وہ فیض اور مخدوم سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر فیض کا رنگ ان کے یہاں بآسانی محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تقلید یا نقالی نہیں کیونکہ ایک ہی عصر اور ایک ہی مکتبِ فکر کے حامل شاعر ایک دوسرے سے یوں اثر پذیر ہوتے ہی ہیں لیکن فیض اور ساحر میں چونکہ فیض کو تقدم حاصل ہے اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ساحر کے ہاں فیض کا اثر ملتا ہے۔ نظموں میں یہاں میں "آوازِ آدم" کا حوالہ دوں گا۔ فیض کے لہجہ کا آہنگ پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اشعار ؎

۷۰

ساحر لدھیانوی

دبے گی کب تلک آوازِ آدم ہم بھی دیکھیں گے
رکیں گے کب تلک جذباتِ برہم ہم بھی دیکھیں گے
چلو یوں ہی سہی، یہ جورِ پیہم ہم بھی دیکھیں گے
مکافاتِ عمل، تاریخِ انساں کی روایت ہے
کرو گے کب تلک ناوک فراہم ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

غزلوں میں تو یہ کیفیت کہیں افزوں ہے۔ بے شمار اشعار پڑھتے ہوئے فیض کا اسلوب یاد آتا ہے ؎

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ ہستی سنوارنے
اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلم جانا
اہلِ دل کے لیے وہ بات عجیب آج بھی ہے
میں، اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا تھا غمِ روزگار نے
شغلِ مے پرستی گو جشنِ نامرادی تھا
یوں بھی کٹ گئے کچھ دن تیرے سوگواروں کے
اب آئیں یا نہ آئیں ادھر پوچھتے چلو
کیا چاہتی ہے ان کی نظر پوچھتے چلو

ساحر نے اپنے متقدمین اور معاصرین کا اثر قبول کیا ہے یہ ایک فطری امر ہے لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ساحر نے خود اپنا رنگ آپ پیدا کیا۔ ان کا اپنا اسلوب ہے جو اردو شاعری میں ایک امتیازی اسلوب کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

کتابیات

١۔ پرکاش پنڈت — "ساحر اور ان کی شاعری"

٢۔ ساحر لدھیانوی — آؤ کوئی خواب بنیں

٣۔ " " — پرچھائیاں

٤۔ " " — تلخیاں

٥۔ " " — گاتا جائے بنجارہ

٦۔ سجاد ظہیر — روشنائی

٧۔ سردار جعفری — ترقی پسند ادب

٨۔ صابر دت — "فن اور شخصیت" ساحر لدھیانوی نمبر

٩۔ کرشن ادیب — ساحر : یادوں کے آئینہ میں

١٠۔ مخمور سعیدی — ساحر لدھیانوی ، ایک مطالعہ

١١۔ ناز صدیقی — ساحر لدھیانوی ، شخص اور شاعر

ساحر لدھیانوی کا شمار اردو کے ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ ساحر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے، وہ مارکسی رجحانات کے حامل تھے لیکن اُن کے ہاں شدت پسندی اور نعرہ بازی نہیں ملتی۔ متوازن اور معتدل لب ولہجہ اور ایسے ہی شعری رویہ کے باعث اُن کے کلام میں ایک دلکشی پائی جاتی ہے اور یہی چیز ساحر کی عوامی مقبولیت کا باعث رہی۔

ساحر کے ہاں غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی اور اکثر جگہوں پر ان دونوں کا خوبصورت امتزاج خاصا جادو جگا دیتا ہے۔ ساحر نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی، اور ہر دو اصناف میں انھوں نے اپنا رنگ پیدا کیا۔ فلمی دنیا میں نغمہ نگاری کے باعث ساحر کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ ساحر کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر فلمی نغموں کو ادبی حیثیت دی، معیار اور وقار عطا کیا۔

سچ پوچھیے تو ساحر عوام کے شاعر تھے، عوامی جذبات و محسوسات، عوامی مسائل اور عوام کے دل کی دھڑکنوں سے اُن کی شاعری عبارت ہے۔

اس مختصر سے مونوگراف میں ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور شاعری کا اجمالی لیکن جامع جائزہ لیا گیا ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور جامعہ عثمانیہ سے اپنی تعلیم مکمل کی، وہ اس وقت سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی (آندھرا پردیش) میں شعبہ اردو کے سربراہ ہیں۔ تنقید میں اُن کی دو درجن کے قریب کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں "رشید احمد صدیقی، شخصیت اور فن" "عزیز احمد کی ناول نگاری" "اقبال: ماورائے دیر و حرم" اور "غالب کے نقاد" خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مرقع نگار کی حیثیت سے بھی پروفیسر جاوید کو پایۂ امتیاز حاصل ہے۔

•

Sahir Ludhianvi (Urdu)


ISBN 81-260-0115-1

Rs. 25/-